



نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
رسالہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (۵) ششماہی تین روپیہ سے
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۵ فرست مضامین مئی ۱۹۳۲ء شمارہ ۵

۲	ملاحظات
۹	عہد حاضر کے فسانہ نگار
۴۲	بازی گر
۴۷	نیاز مندان لاہور سے
۵۱	دنیا سے اسلام کا عظیم انقلاب
۵۸	مکتوبات نیاز
۶۳	باب الاستفسار
۶۷	باب الانتقاد
۷۱	غالب کا ایک شعر
۷۷	فاقہ کی ایک شام
۷۸	بصارت و بصیرت
۷۹	انتخاب کلام
	محمد اسحاق
	علی اختر
	کوکب - تپش
	دیوان امر ناتھ محسن

”بیراگ کا بزوک“ نیاز فچپوری کا جدید افسانہ ماہ آئندہ شروع ہوگا۔

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۵

مئی ۱۳۳۷ء

شمارہ ۵

ملاحظات

رجالِ بختاری

امامیہ مشن لکھنؤ کچھ عرصہ سے تبلیغی رسائل شائع کرنے میں کافی محنت و مساعی سے کام لے رہا ہے اور نگار کے صفحات پر اس کے متعدد رسائل کا ذکر آچکا ہے

یہ کتاب بھی اسی مشن کی پندرہویں دینی خدمت ہے اور اس سے مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ اہل سنت کی صحیح اور خصوصیت کے ساتھ بخاری کی احادیث جن راویوں سے لی گئی ہیں وہ بالکل ناقابل اعتبار ہیں۔ کتاب زیر بحث میں ردیف الف سے ردیف ز تا تک صرف ۵۶ راویوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ابو ہریرہ سے شروع ہو کر زہری پر ختم ہوتا ہے۔ باقی تین یا چار جلدوں میں اس تصنیف کو مکمل کر دیا جائے گا

اخبارات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل سنت صحافیوں نے اس تصنیف کو ناقابل برداشت حملہ خیال

کیا ہے اور وہ اس کو اپنے اکابر کی کھلی ہوئی توہین قرار دے کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس ماہ کے ملاحظات میں اسی مسئلہ پر اظہار رائے کریں، اس لئے نہیں کہ ہمارے نزدیک یہ کتاب کوئی خاص اہمیت رکھتی ہے یا یہ کہ جماعت احناف کے اخباروں کی چیخ پکار کوئی پسندیدہ فعل ہے، بلکہ صرف اس بنا پر کہ ”مذہب“ کا خیال اب روز بروز کس درجہ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے اور علمبردارانِ مذہب کا طرزِ عمل اور اُن کا تبلیغی جہادِ ملک کی ترقی کے لئے کتنا زبردست سنگِ راہ ہے

مذہب کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد ایک شخص کے سامنے سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس مذہب کو صحیح باور کرے اور کس کو غلط، کیونکہ ہر مذہب دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے اور اس لئے شخص ثالث کے لئے سولے اس کے کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ یا تو سب کو اصولاً صحیح سمجھے یا سب کو باطل قرار دے۔ پھر یہ اختلاف مذہب ہی تک محدود نہیں بلکہ ان جماعتوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جو اپنے آپ کو ایک ہی مذہب سے منسوب کرتی ہیں، مثلاً ہندوؤں میں آریہ سماجی اور سناتن دھرمی کا اختلاف، عیسائیوں میں پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک کا اختلاف، مسلمانوں میں، شیعہ، سنی، وہابی اور احمدی وغیرہ کا اختلاف کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو نہ صرف خاطی و گناہگار جانتا ہے بلکہ بیدین سمجھ کر مذہب ہی سے خارج کر دینے پر تلا ہوا ہے

دیگر مذہب سے قطع نظر کر کے اس وقت صرف اسلام کو لیجئے، اور غور کیجئے کہ یہ اختلاف اس میں کیوں پیدا ہوا تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کا تعلق نہ اصول عقائد سے ہے نہ خدا اور رسول سے، بلکہ اس کا سبب یا تو تاریخی تحقیق کا اختلاف ہے یا اُن ذاتی جذبات کا جو شخص مفاد کے ماتحت ایک دوسرے سے متصادم ہوئے۔ مثلاً آپ مسئلہ خلافت ہی کو لے لیجئے کہ ایک جماعت، اقل تین خلفاء کو غاصب قرار دے کر جو تھے خلیفہ کو رسول اللہ کا جائز جانشین تصور کرتی ہے اور دوسری جماعت اس کی مخالف ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ خلافت کی ترتیب واقعی رسول اللہ کی مرضی کے خلاف ہوئی اور فی الحقیقت حضرت علی کا حق غصب کیا گیا، تو بھی اس سے صرف یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ پہلے تین خلفاء نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے راستی کو چھوڑ دیا یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ مسلمان ہی نہ تھے، لیکن کیا اسلام، نام خلفاء پر ایمان لانے کا ہے، اور کیا ان کے متعلق رائے کا اختلاف اصل مذہب کا اختلاف ہے، عقایدِ اسلامی کا اختلاف ہو؟ یعنی اگر خلفاءِ ثلاثہ کو برا کہنا بیدینی کا مترادف نہیں تو کیا انھیں اچھا کہنا ایک انسان کو مذہب سے خارج کر سکتا ہے

پھر جب اصل مذہب یہ نہیں ہے تو بحث کا پہلو صرف تاریخی و سیاسی رہ جاتا ہے اور تاریخ و سیاست کی بحث و تجویس کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اور نہ اس کا اختلاف کسی جنگ و نزاع کا موجب ہو سکتا ہے۔ لیکن کس قدر حیرتناک امر ہے کہ آج بھی جبکہ نہ خلفاءِ ثلاثہ کا وجود باقی ہے اور نہ آل رسول کی حکومتِ سیادت کا مسئلہ مابہ النزاع، یہ جھگڑا بالکل اسی طرح چلا آ رہا ہے جس طرح قرونِ اولیٰ میں پایا جاتا تھا اور ان میں سے کسی کو یہ سمجھنے کی توفیق نہیں

ہوتی کہ اگر علی خلافت اولیٰ کے مستحق تھے تو بھی اب انھیں خلیفہ اول نہیں بنایا جاسکتا اور اگر نہیں تھے تو خواہ مخواہ اس ذکر کی تکرار کی ضرورت کیا ہے

بہ ظاہر یہ امر کتنا صاف و صریح ہے، ایک کسی کو ادنیٰ غور و تامل کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ کیوں؟ اس کا سبب بھی وہی مولویانہ ذہنیت (Priest mentality) ہے جو شروع سے اسلام کی بنیاد کو کھودتی چلی آرہی ہے اور اب تک اس نے اپنا یہ کام ختم نہیں کیا

عوام تاریخ کے نازک اختلافی مسائل کو کبھی نہیں سمجھ سکتے اور ان کے نزدیک مذہب کا مفہوم وہی ہوتا ہے۔ جو مولوی انھیں سمجھا دیتے ہیں۔ اس لئے اس باب میں اگر قابل الزام کوئی جماعت ہے تو وہ شیعہ و سنی علماء کی ہے۔ جنہوں نے فروعی اختلافات کو طرح طرح کی رنگ آمیزیوں سے پیش کر کے عوام کو اصل مذہب کی طرف سے غافل کر رکھا ہے اور دوسرے غیر ضروری و لائینی مسائل کو عین مذہب قرار دے کر مسلمانوں میں باہم دگر بھوٹ ڈال رکھی ہے

ایک مولوی کا منصب مذہبی پیشوا ہونے کی حیثیت سے صرف یہ ہونا چاہئے کہ وہ لوگوں کو اخلاق اسلامی کی تعلیم دے سوسائٹی کے جو اصول مذہب نے مقرر کر دیے ہیں ان پر عامل ہونے کی لوگوں کو ہدایت کرے، نہ یہ کہ فضول مذہبی منظرے قائم کر کے لوگوں میں جذبہ منافرت پیدا کرے، لیکن وہ ہمیشہ وہی کرتا ہے جو اسے نہ کرنا چاہئے اور کبھی وہ نہیں کرتا جو اس کا حقیقی فرض ہے، کیونکہ اس کے سامنے سوال نہ اصلاح معاشرت و اخلاق کا ہے، نہ فضائے امن و سکون کا بلکہ صرف ذاتی اقتدار و وجاہت کا، اپنی سرمایہ داری اور نمود و نمائش کا اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب وہ لوگوں میں فرقہ وارانہ جذبات پیدا کر کے خود قاید و رہنما کی حیثیت سے ان پر اپنی حکمرانی کے حقوق ثابت کر دیے وہ جس وقت وعظ و نصیحت کے لئے منبر پر رونما ہوتا ہے تو وہ صرف دو قسم کی روایتیں بیان کرتا ہے ایک وہ خلافت عقل قصص و حکایات جو معجزہ و کرامات کو ظاہر کرتی ہیں اور دوسری وہ جو فرقہ وارانہ عصبیت کو مستحکم کرنے والی ہیں یعنی اسوہ رسول و خلفاء، اور سیرۃ اکابر و اسلاف میں صرف دو ہی باتیں اسے نظر آتی ہیں ایک ذہنی آزادی کو چھیننے والی اور دوسری افراد انسانی کو باہم گرو دست و گریباں ہونے پر آمادہ کرنے والی۔ ایک شیعہ عالم اگر مجلس کو مخاطب کرے گا تو وہ جناب علی و آل رسول کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے اپنی تمام قابلیت اس طرح صرف کرے گا کہ خود رسول کے مناقب بیان کرنے کے لئے بھی اس کے پاس الفاظ باقی نہ رہ جائیں گے اور ایک سنی عالم جب وعظ کرے گا تو وہ حقیقتوں کو نظر انداز کر کے اس حد تک نیچے آجائے گا کہ بزد کو برا کہنا یا برا سمجھنا بھی اس کے نزدیک ناجائز ہوگا

یہیں لکھنؤ کے ایک نہایت مشہور شیعہ واعظ کسی مجلس میں معراج نبوی کا ذکر فرما رہے تھے، جب براق کی لنو و خلافت عقل تصریحات سے فارغ ہونے کے بعد وہ اس بیان پر آئے کہ رسول اللہ نے اس کی سواری کی تو اسی سلسلہ میں نہایت

زور و شور کے ساتھ ٹیپ کا یہ بند بھی فرمایا کہ اُس کی فضیلت کو دیکھو جو خود رسول اللہ کے دوش پر سوار ہوا ہو۔ مدعا یہ کہ اگر رسول کو سواری کے لئے بُرا ق عطا ہوا تو حسین کو سواری کے لئے خود رسول عطا ہوئے اور اس طرح گویا عوام کو یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ امام حسین کا مرتبہ رسول سے زیادہ بلند تھا۔ پھر جب کسی مذہب کے علماء کی شان استدلال یہ ہو اور وہ ایسی معمولی معمولی باتوں کو شاعری سے کام لے کر دلیل و حجت قرار دیں تو عوام جتنے بھی گمراہ ہوں کم ہے لکھنؤ کے ایک دوسرے سنی عالم کے اخلاق کا حال سنئے جو بڑے صاحب دل صوفی بھی سمجھے جاتے ہیں اور جن کا درجہ ہر وقت زائرین کی کثرت سے گرم رہتا ہے۔ ایک بار میرے ایک شناسا ان سے ملنے گئے لیکن وہ تنہا نہ تھے بلکہ ایک اور صاحب امامیہ مذہب کے ان کی معیت میں تھے۔ مولانا نے ان کو دیکھتے ہی حد درجہ برہمی کے ساتھ فرمایا کہ ”کل جاؤ یہاں سے، تم اس مردود رافضی کو کیوں ساتھ لے آئے“

لکھنؤ میں شیعہوں کی ایک نہایت مشہور مسجد ناف آبادی میں واقع ہے۔ چند دن کی بات ہے، گاؤں کا ایک سنی مسلمان اس طرف آنکلا، عصر کا وقت تھا، مسجد دیکھ کر اوپر چڑھ گیا اور حوض میں وضو کرنے لگا۔ چند شیعہ وہاں موجود تھے، انھوں نے اس کے طریق وضو کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ یہ مومن نہیں ہے اور اپنے پیش امام کو اطلاع دی، انھوں نے آتے ہی سیکڑوں گالیاں اس غریب کو سنا دیں اور کہا کہ تو نے حوض ناپاک کر دیا۔ چنانچہ وہ جان بچا کر وہاں سے بھاگا اور بعد کو وہ حوض صاف کیا گیا، در اخالیکہ اس حوض میں پیش امام صاحب کے بچوں کے پوترے بھی دھوئے جاتے ہیں بازار کے پان بھی اس میں ڈبو کر صاف کئے جاتے ہیں، لیکن وہ حوض بدستور پاک رہتا ہے اور اس میں کوئی نجاست پیدا نہیں ہوتی

الغرض یہ اور اسی قسم کے ہزاروں واقعات ایسے ہیں جن سے باہمی منافرت کا پتہ چلتا ہے اور چونکہ یہ کیفیت دونوں فریق کے علماء کی پیدا کی ہوئی ہے اس لئے اس کا علاج صرف اس طرح ممکن ہے کہ سب سے پہلے مولویوں کو اُن کے منصب و غطا و ہدایت سے علیحدہ کر دیا جائے اور تبلیغی اقدامات بالکل ترک کر دیے جائیں تبلیغی ادارے خواہ وہ سنیوں کے ہوں یا شیعہ جماعت کے اس وقت تک سوئے اختلاف پیدا کرنے کے کچھ نہیں کر سکے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ چند شیعہ سنی ہو گئے یا چند سنی شیعہ، تو اس سے کون سی بڑی تقویت کسی جماعت کو پہنچ سکتی ہے، جبکہ ذہنی غلامی کے لحاظ سے جو مولویوں کی فرسودہ و خلافت عقل روایات سے پیدا ہو رہی ہے، شیعہ سنی دونوں انسانیت و اخلاق کے لئے یکسر توہین ہیں، اور ان کی جماعت میں کوئی اضافہ کرنا گویا ناکارہ افراد کا بڑھانا ہے

الغرض اشاعت مذہب و تبلیغ میرے نزدیک سخت مضرت رساں تحریک ہے اور اس قسم کے اداروں کو میں ملک و قوم کی انتہائی بد نصیبی خیال کرتا ہوں۔ پھر چونکہ رجال بخاری جس کا ذکر میں نے ابتدا میں کیا ہے، اسی قسم

کی تبلیغی کتاب ہے اس لئے کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاسکتی اور ایسے رسائل سے نہ اس وقت تک کوئی مفید نتیجہ پیدا ہوا ہے اور نہ آئندہ پیدا ہونے کی توقع ہے، کیونکہ وہ کسی سنی عالم کی کتاب ہو یا شیعہ مجتہد کی اس نقص سے کبھی خالی نہیں ہو سکتی کہ اس کی بنیاد صرف منقولات پر قائم ہوتی ہے اور مؤلف کو خود اپنی عقل سے کام لینے کی توفیق کبھی نہیں ہوتی۔ اگر وہ شیعہ ہے تو اس کو بڑا کارنامہ سمجھتا ہے کہ اس نے سنیوں کی کتابوں سے اپنے معتقدات کو ثابت کر دیا اور اگر سنی ہے تو وہ اس کو اپنی بڑی قابلیت جانتا ہے کہ شیعہ علماء کی تالیفات سے اپنے عقائد کا ثبوت اس نے پیش کر دیا، در انحالیکہ تنقید کے ماتحت نہ ان کے حوالے قابل اعتبار ہیں نہ ان کے استناد لایق اعتبار اور دونوں دریا بڑ دکر دینے کے قابل ہیں

تحقیق کی خوبی یہ ہے کہ مذہب سے بالکل علیحدہ ہو کر، فرقہ دارانہ تعصب سے پاک ہو کر مورخانہ انصاف سے کام لیا جائے، لکھنے والا خود اپنی عقل سے بھی کام لے کر کسی نتیجہ پر پہنچے، لیکن جب ہمارے علماء کے ذہنی افلاس کا یہ حال ہے کہ مذہب کے باب میں عقل سے کام لینا کفر و ارتداد قرار دیں، تو ان سے یہ توقع رکھنا کہ کوئی سمجھ کی بات ان کے فہم سے نکلے گی یکسر حماقت و بے عقلی ہے

اسی کتاب میں اکثر راویوں کو صرف اس دلیل کی بناء پر ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے کہ وہ علی اور آل رسول کے خلاف تھے، مدعا یہ کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے علی کا موافق نہ ہو تو وہ کبھی سچ بول ہی نہیں سکتا، اس کے کسی بات کا اعتبار کرنا ہی نہیں چاہئے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ علی اور آل رسول کے باب میں اس کی قیادت قابل اعتبار نہیں، نہ یہ کہ اس کا ہر قول لغو و باطل ہے۔ بہر حال جس ذہنیت کے ماتحت یہ کتاب شائع کی گئی ہے نہ وہ کبھی قابل ستائش ہو سکتی ہے اور نہ وہ ذہنیت جو اس کی مخالفت میں ظاہر کی جا رہی ہے،

رجال بخاری قابل اعتبار ہوں یا نہ ہوں، اہل سنت کبھی "بخاری" پر ایمان لانا ترک نہیں کریں گے۔ خواہ اس کی روایات سے کتنی ہی رسول اللہ کی توہین ہوتی ہو اور شیعہ لاکھ تحقیق کا دعویٰ کریں لیکن اس جذبہ سے ان کی کوئی کتاب خالی نہ ہوگی کہ جو شخص علی کی ولایت کا قابل نہیں وہ رسول و خدا کا دشمن ہے اگر ایک طرف خلفاء ثلاثہ کی مدح و فضیلت میں خلافت موضوع احادیث کا انبار پایا جاتا ہے تو دوسری طرف حضرت علی و آل رسول کی شان میں بھی کچھ کم غلو سے کام نہیں لیا گیا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد ہی سیاسی اختلافات شروع ہو گئے

تھے۔ اور ہر جماعت اپنی موافقت میں وضع احادیث سے کام لے رہی تھی، یہاں تک کہ دو تین صدی کے اندر کذب و افترا کا اتنا زبردست دفتر مرتب ہو گیا، کہ آج ایک نقاد کے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ وہ کس حدیث کو غلط قرار دے بلکہ سوال یہ ہے کہ وہ کس کو صحیح باور کرے۔ پھر جب حالت یہ ہے تو ایسے لٹریچر پر مذہب و تحقیق کی بنیاد قائم کرنا کس حد تک ترین عقل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور ایک تیسرا شخص جو نہ سنی ہے نہ شیعہ وہ کیونکر "رجال بخاری"

کی صحت کا قائل ہو سکتا ہے جبکہ اس میں بھی اسی روایتی استدلال سے کام لیا گیا ہے اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو کیونکر صحیح باور کر سکتا ہے جبکہ واقعی خود بخاری کے اندر کثرت سے ایسی احادیث موجود ہیں جنہیں عقل سلیم کبھی باور نہیں کر سکتی

اس لئے میرے نزدیک اگر امامیہ شن نے یہ کتاب لکھ کر کوئی اچھی خدمت انجام نہیں دی تو اہل سنت بھی اس کے خلاف ہنگامہ برپا کرنے میں کسی دانشمندی سے کام نہیں لے رہے۔ اگر یہ تبلیغی سرگرمیاں دور نہیں ہو سکتیں تو اہل حق کا علاج صرف یہی ہے کہ ان کی طرف اعتنا نہ کیا جائے، لیکن جب تک دنیا میں مولوی کا وجود باقی ہے۔ یہ ممکن نہیں اور فتنہ و فساد کی وجہ سے آخر کار مسلمان قوم کو تباہ ہونا ہے جف القلم بما ہو کائن لہ لکھنو کا محرم ملک میں خاص شہرت رکھتا ہے اور یقیناً اس شہرت کی بنیاد شاہان اودھ کے زمانہ میں پڑی ہوگی جب شیعی حکومت ہونے کے لحاظ سے تمام مراسم عوامی، و مجالس ذکر شہادت کے لئے یہاں غیر معمولی اہتمام کیا جاتا تھا۔ اور یہاں کے بعض بادشاہوں نے جو فنون لطیفہ کے ادب شایق و ماہر تھے، مرثیہ خوانی میں موسیقی کو شامل کر کے سوز خوانی کی بنیاد ڈالی تھی۔ لیکن اب اس اُجڑے ہوئے دیار میں اس قسم کی گھما گھمی یا اس انداز کی کوئی نئی خوبی تو کہیں نظر نہیں آتی، لیکن ایک نئی خصوصیت یہ ضرور پیدا ہو گئی ہے کہ شیعی مجالس کے جواب میں اہل سنت بھی ذکر شہادت کی محفلیں مرتب کرتے ہیں یعنی اگر ایک طرف واقعہ اکبریا کے بیان میں ضمناً یا کسایتہ خلفاء پر طعن و تشنیع ضروری سمجھی جاتی ہے، تو دوسری طرف شہادت حسین کا ذکر تو خیر کیا لیکن خلفاء ثلاثہ کی افضلیت کا بیان نہایت زور و شور سے ہوتا ہے

الغرض دو اکھاڑے پوری قوت کے ساتھ قائم کئے جاتے ہیں اور ان دونوں میں سے ہر ایک کا مقصد صحیح اسوہ حسینی پیش کرنے کے بجائے فرقہ دارانہ جذبات کو مشتعل کرنا ہوتا ہے، اگر شیعی مجالس میں حضرت علی اور امام حسین کی فضیلت بیان کرنے میں غلو سے کام لے کر ان کو رسول کے مرتبہ سے بھی بڑھا کر خدا بنا دیا جاتا ہے تو مسنیوں کی محافل میں یزید کی حمایت سے بھی اظہار بیزاری نہیں کیا جاتا

اس میں شک نہیں کہ واقعہ اکبریا تاریخ اسلامی کا اتنا اہم و زبردست واقعہ ہے کہ اس سے کسی غیر مسلم کو بھی انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی، چہ جائیکہ مسلمان، لیکن کیا تعزیر داری و سینہ کو بی کے علاوہ اس میں کوئی اور درس اخلاق پنہاں نہیں ہے۔ اور کیا کوئی شیعہ خواہ وہ واعظ و حدیث خواں ہو یا اُجرت پر نام کرے والا، اس امر کو ثابت کر سکتا ہے کہ اس کے اخلاق پر بھی اس کا کوئی اثر پڑتا ہے

اسی طرح میں اہل سنت علماء سے پوچھتا ہوں کہ عشرہ محرم میں جو مواظظ وہ یہاں اگر ارشاد فرماتے ہیں کیا وہ خود بھی ان سے متاثر ہو کر اسوہ صدیق و فاروق کا کوئی شاہد اپنے اندر پیدا ہوتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ مگر

یہ سوال تو اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب حقیقتاً ان کا مقصد اصلاح اعمال و اخلاق ہو، لیکن جب سرے سے ان کا مدعا ہی صرف فرقہ وارانہ جذبات پیدا کرنا ہو تو پھر یہ گفتگو فضول ہے۔ رہ گئی تحقیق تاریخی سو اس کا یہ حال ہے کہ شاید ہی طلسم ہو شرابا میں ایسے ایسے عجیب و غریب واقعات درج ہوں گے جو سنی و شیعہ و اعلیٰین کی زبان سے سننے میں آتے ہیں۔ پھر میں حیران ہوں کہ جب انکی حدیث خوانیاں اور وعظ فرمایاں مذہب و اخلاق، تاریخ و تحقیق کسی لحاظ سے قابل ذکر نہیں تو ان کی ضرورت کیا ہے اور کیوں اسلام کو رسوا کیا جاتا ہے

اگر حضرات شیعہ اس زمانہ میں مجالس عزاداری منعقد کرنے پر اپنے عقاید کے لحاظ سے مجبور ہیں تو سنیوں کا یہ فرض ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ وہ ان کے مقابلہ میں مناظرانہ و معاندانہ قسم کی محفلیں برپا کریں اور ٹھیک اس وقت جبکہ شیعوں کے جذبات میں ایک خاص قسم کا ہیجان ہوتا ہے، اپنی مخالفانہ تقریروں سے فضا کو مکدر کر دیں سال کے بارہ مہینوں میں صرف عشرہ محرم کو خلفائہ ثلاثہ کے فضائل بیان کرنے کے لئے مخصوص کر لینا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کس قسم کی ذہنیت کا اظہار ہے۔ اور یہ اگر روٹی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے تو اس کو کس مصلحت کی بنا پر روار کھا جاسکتا ہے،

مجموعہ استفادہ و جواب

کی کتابت ہونے کے بعد یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کی ضخامت کم از کم ڈیڑھ ہزار صفحات تک پہنچ جائے گی۔ اور یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ایک ہی جلد میں اسے شائع کیا جائے

اس لئے تین جلدوں میں اس کو پورا کیا جائے گا۔ اور ہر جلد کی قیمت چار روپیہ ہوگی۔ پہلی جلد اس سال کے اخیر تک شائع ہو جائے گی اور باقی دو جلدیں سال آئندہ میں شائع ہو سکیں گی۔ اب براہ کرم کوئی صاحب غیر کامنی آرڈر بھیج کر اس کے حاصل کرنے کی کوشش نہ فرمائیں۔ اس وقت تک جن حضرات کی رقم وصول ہو گئی ہے انکو پہلی جلد بعد اشاعت بھیج دی جائے گی۔ تینوں جلدیں اپنی اپنی جگہ بالکل مکمل چیز ہوں گی

پہلی جلد مکمل ہونے کے بعد اس کی فرست نگاریں شائع کر دی جائے گی تاکہ ناظرین کو اندازہ ہو جائے کہ اس میں کون کون سے مباحث آگئے ہیں

جو حضرات ابھی سے صرف خط بھیج کر اپنا نام درج کرا لیں گے ان کے ساتھ محصول ڈاک کی رعایت ضرور کی جائیگی

میجر نگار لکھنو

”عہد حاضر کے فسانہ نگار“

افسانہ کے متعلق مشہور انگریزی شاعر ڈرائیڈن لکھا ہے کہ ”افسانہ ہشاعری اور مصوری کا نچوڑ ہے“
 ادا م بیکر کا خیال ہے کہ ”افسانہ ادب کی شاعری ہے“
 سٹلنگ فلیٹ لکھا ہے۔ ”کم از کم دل کو خوش کرنے کے لئے کہانی سچی معلوم ہونی چاہئے۔ وہ یر محل، دلچسپ مختصر اور انوکھی بھی ہونی چاہئے۔ اور جب کبھی وہ ان اصول سے انحراف کرتی ہے تو عقلمند سو جاتے ہیں اور بیوقوفوں کو واہ وا کے لئے پھوڑ دیتے ہیں“
 سر والتر اسکاٹ لکھا ہے۔ ”میں حقیقت کے رخ سے نقاب نہیں اٹھا سکتا۔ میں تو تمہیں افسانہ سناتا ہوں کہ میں نے خود اسے یوں ہی سنا ہے“

ہومر کی رائے ہے۔ ”افسانہ ایزدی نغمہ کی مانند نرم رو ہے“
 دنیا کی ہر زبان کے علم و ادب پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ”افسانہ“ کا وجود ہر ملک ہر قوم اور ہر زبان میں کسی نہ کسی حد تک ضرور پایا جاتا ہے خواہ وہ زبان اور ملک اپنی معاشرت اور علم کی وجہ سے ترقی کے اعلیٰ مدارج پر گامزن ہو یا پستی کی ادنیٰ ترین منزلوں میں ہو۔ چنانچہ۔ امریکہ، افریقہ، اٹریلیا، چین، جاپان، روس، جرمنی، ترکی، انگلستان، مصر، عرب، اسپین، اطالیہ، فرانس اور ہر دوسرے ملک میں، ”افسانے“ اپنی مختلف صورتوں میں موجود ہیں۔ کسی ملک میں افسانہ نگاری اوج کمال پر پہنچی ہوئی ہے تو کسی زبان میں ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے مختلف ممالک میں ”افسانہ نگاری“ نے، وہاں کے تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ اور یہ بات افسانوں کو پڑھنے سے خاص طور پر واضح ہوتی ہے۔ مثلاً چینی افسانے، جو اپنی افسانویت کے لحاظ سے دنیا میں بہترین سمجھے جاتے ہیں اپنی توہم پرستی کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ کیونکہ چین کی معاشرت میں ”توہم پرستی“ کا بہت بڑا عنصر شامل ہے۔ اسی طرح عربی افسانوں میں وہاں کی معاشرت قدیم کا لحاظ کرتے ہوئے ”عشقیہ فسانے“ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ترکی افسانوں میں حریت اور جنگی جوش و خروش کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ مصری افسانوں میں ”عربانی“ کی جھلک نظر آتی ہے روسی فسانے“ انقلاب اور اشتراکیت پسندی کی کسی نہ کسی طرح تعبیر کرتے ہیں۔ اور عموماً روزمرہ کی سادہ زندگی کا خاکہ ہوتے ہیں

امریکی افسانوں میں ”سٹراغرسانی“ کی بہتات ہوتی ہے اور اسی طرح ہندی فسانوں میں، توہم پرستی اور اصنام پرستی، دونوں ملی ہوئی پائی جاتی ہیں

جہاں تک میرے مطالعہ کو دخل ہے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ دنیا کے ادب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ چینی افسانے، اپنی افسانویت کے لحاظ سے بہترین اور بے حد دلکش ہوتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ چینی افسانے عجیب و غریب اور مافوق الفطرت واقعات اور حالات کی تصویر ہوتے ہیں۔ اور انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ عجیب و غریب اور غیر فطرتی باتوں کو زیادہ دلچسپی سے سنتی.... اور پسند کرتی ہے۔ اگر چینی افسانوں سے ”توہم پرستی“ کا جز نکال دیا جائے۔ تو پھر ان میں کچھ نہیں رہ جاتا۔ سارا فسانہ، بے جوڑ اور غیر موزوں جملوں کا ایک پیچر بن جاتا ہے۔ یہی بات ہندی فسانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر روسی یا عربی فسانہ نگاری کو لیا جائے۔ یا انگریزی اور فرانسیسی فسانہ نگاری پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ وہ عین فطرت کے مطابق ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ اور ان فسانوں کے کردار (Characters) ہمیں اپنے ہی جیسے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ قطع نظر اس کے اگر چینی فسانوں یا ہندی فسانوں کے کرداروں کو دیکھیں تو مقدم الذکر میں یا تو طوفانِ نوح سے قبل کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ جب ان کی عمریں پانچ پانچ سو برس کی ہوتی تھیں یا مؤخر الذکر میں انسان دیوتا بن جاتے ہیں

یہ خصوصیات جو میں نے بیان کی ہیں عہدِ قدیم کی فسانہ نگاری میں عموماً پائی جاتی ہیں موجودہ دور میں، ہر زبان کے فسانوں میں، انقلاباتِ زمانہ نے بہت کچھ تغیرات پیدا کر دیے ہیں۔ اور ہر زبان میں فسانے فطرت کے مطابق ڈھالے جاتے ہیں۔ اور ”فسانوں“ سے ”توہم پرستی“ کا عنصر رفتہ رفتہ مٹا جا رہا ہے

اُردو کے، عہدِ طفلی کے اس صنف پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ جو کہانی اور قصوں کی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں محیر العقول اور عجیب و غریب باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اور وہ واقعات درج کئے گئے ہیں۔ جو بڑی حد تک کیا بالکل ناممکنات میں سے ہیں۔ چنانچہ ”الف لیلہ“ کی داستانیں اور ”طلسم ہوشربا“ اور ”حاتم طائی“ کے فسانے، سب عالمِ انسانی کے علاوہ، کسی اور دنیا کے واقعات پیش کرتے ہیں۔ جو اس دنیا میں رونما نہیں ہوتے۔ نہ جن کے ہونے کا امکان ہے

فسانے میں چند خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) پلاٹ (۲) کردار نگاری (۳) طرزِ بیان۔ جس افسانے میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہوں وہی بہترین فسانہ کہا جاسکتا ہے اور جو فسانہ نگاران امور کا لحاظ رکھتے ہوئے فسانہ تحریر کرتا ہے وہ بہترین فسانہ نگار کہلاتا ہے۔ لیکن ایسے فسانہ نگار ہر ملک اور ہر زبان میں گنتی ہی کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اردو فسانہ نگاری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ جس کے متعلق مجھے یہاں کچھ عرض کرنا ہے

اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ اعلیٰ اور ادنیٰ معیار کے فسانے ہر زبان میں پائے جاتے ہیں۔ مگر اُردو ”فسانہ نگاری“ اس وجہ سے اور زیادہ غیر اہم اور سہل ہوتی جا رہی ہے کہ جو شخص مضمون نگاری کی طرٹ توجہ کرتا ہے وہ

پہلے "فنِ افسانہ نگاری" کو تختہ مشق بنا رہا ہے۔ حالانکہ مضمون نگاری شروع کرنے سے قبل مبتدی کو اپنے ذوق کا صحیح اندازہ کر لینا چاہئے کہ وہ کس "صنفِ ادب" کی طرف مائل ہے۔ اور ایڈیٹر، اس پر غور و خوض کے بغیر، اس کو اپنے رسالوں میں تعریف اور شکر یہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ ان کا مقصد اس سے مضمون نگار کی ہمت افزائی کرنا ہوتا ہے لیکن اس ہمت افزائی سے "اردو فسانہ نگاری" پر جو بڑے اثرات مسلط ہوئے ہیں ان کو دور کرنا محال ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ہمت افزائی کے اور بہت سے طریقے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں جو فسانے لکھے جاتے ہیں۔ وہ عموماً عیوب سے آلودہ اور بہت کم اوصاف سے متصف نظر آتے ہیں

اگر کسی فسانے میں کوئی بات موجود ہو تو طرزِ نگارش نہایت بھونڈا اور استعارات اور تشبیہیں نہایت غیر موزوں اور مہمل ہوتی ہیں۔ کسی فسانے میں "عربیائی" کا طوفان سامو جس مارتا ہوا نظر آتا ہے تو کسی میں بے جا تفصیل کا ایک طومار باندھ دیا جاتا ہے۔ کہ پڑھنے سے دل گھبراتا ہے۔ اگر کسی فسانے میں "افسانویت" کا لحاظ بہ مشکل تمام رکھا جاتا ہے تو الفاظ اس قدر موٹے موٹے جمع کر دیے جاتے ہیں۔ اور طرزِ بیان اس قدر سنجیدہ، اور بعض اوقات اس قدر غیر دلچسپ ہوتا ہے کہ سارا "فسانہ" اپنی خشکی کے لحاظ سے "ریگستان" بن جاتا ہے

بہر کیف، فسانہ نگاری پر اس مختصر تمہید کے بعد، اب میں نفسِ مضمون کی طرف آپ کی توجہ منعطت کرتا ہوں۔ یعنی اردو کے عہد حاضر کے فسانہ نگار، کس پایہ کے ہیں۔ اس مضمون میں نہ تو میں افسانوں پر تنقید کرنا چاہتا ہوں نہ تنقید، نہ تقریفاً لکھنا چاہتا ہوں نہ تبصرہ۔ بلکہ چند فسانہ نگاروں کا (کیونکہ میرے نقطہ نظر سے اردو میں چند ہی فسانہ نگار موجود ہیں۔ ورنہ اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے تو ہر اردو لکھنے والا افسانہ نگار ضرور ملے گا۔ اور اس لحاظ سے فسانہ نگاروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جائے گی) ایک مختصر سا تذکرہ پیش کرنا مقصود ہے جس میں یہ دکھایا جائے گا کہ ان کی فسانہ نگاری میں کیا خصوصیات موجود ہیں اور ان کا طرزِ نگارش کن خوبیوں کا حامل ہے۔ اور ان کے فسانوں سے عوام کو اور "اردو ادب" کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے

دورِ اوّل

(خ)

خواجہ حسن نظامی

آپ کے فسانے عموماً غدرِ دہلی سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے واقعات آپ اپنے افسانوں میں اس قدر دلچسپ اور ساتھ ہی ساتھ موثر پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ کہ آدمی کے آنسو نکلنے لگیں زبان دہلی کی صاف اور شستہ ہوتی ہے قدیم دہلی کی زبان اور محاورات کا بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ پلاٹ کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ زندگی کے کسی ایک واقعہ کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ طرزِ بیان، اس میں کوئی شک نہیں،

کہ، موثر ہوتا ہے لیکن دیر پائیں۔ کردار نگاری کی طرف خاص توجہ رکھی جاتی ہو واقعات، انسانی فطرت کے بالکل مطابق ہوتے ہیں۔ تصنع اور مبالغہ سے کام نہیں لیتے۔ نمونے ملاحظہ ہوں

”اب تو کوئی اُمید دلی آسکنے کی نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں پر بہت سے بُرے وقت آپگے ہیں۔ حضرت بابر ہم سے زیادہ مصیبتیں بڑھ چکی ہیں۔ مگر وہ اتنے بایوس نہیں تھے جتنے ہم بایوس ہیں۔ کیونکہ اُن کی ہمت کے سامنے ساری دنیا کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ان کی تلوار میں زور تھا۔ وہ جب چاہتے تھے، ہزاروں، لاکھوں آدمی ان کی حمایت کو کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور ان کی مصیبت دُور ہو جاتی تھی۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ اس شہر کا ایک آدمی بھی ہمارا ہمدرد نہیں معلوم ہوتا۔ اور دنیا میں ہمدردی جب ہی ہوتی ہے کہ ہمدردی کرنے والے کو کسی سے کچھ اُمید اور توقع ہو۔ ہم سے کسی کو کیا اُمید ہوگی۔ اور کیا توقع ہوگی۔ سب جانتے ہیں کہ ہماری حکومت ختم ہو چکی۔ ہمارے اقبال کا چراغ گل ہو چکا ہمارا سب حمایتی مر چکے۔“

”قسمت بیگ کی موثر اور مسلسل اور برجستہ تقریر کا ایک دوسرا اثر پیدا ہوا۔ اور ہمارا راج اپنے مہمانوں سمیت، پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور بے اختیار ہمارا راج کی زبان سے نکلا ”کیا تم تیموری شہزادہ ہو؟“ قسمت بیگ کو جوش آگیا۔ اور اس نے کہا۔ ”شاہزادہ نہیں ہوں، آہ زادہ ہوں۔ دنیا کی مصیبتوں کی سب اذیتیں میں نے اٹھائی ہیں۔ تیموری خاندان تو اب مٹ چکا، جس نے باوجود انسان ہونے کے دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کی کوشش کی تھی اور غلام بنالیا تھا“

راشد الخیری

آپ ایک کہنہ مشوق فساد نگار ہیں۔ اور آپ کے فسانوں میں ”غم“ کا عنصر غالب رہتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کا خطاب ”مصور غم“ نہایت موزوں و مناسب ہے۔ آپ کے پلاٹ بچد دلچسپ ہوتے ہیں۔ اور کردار نگاری پر بھی آپ کو کافی دسترس حاصل ہے۔ آپ کے فسانے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ طرزِ بیان بچد موثر اور دل و زہن ہوتا ہے۔ اور یہ ممکن نہیں کہ سنگدل سے سنگدل انسان بھی آپ کے فسانوں کو پڑھ کر آنسو بہائے بغیر رہ سکے۔ زبان خالص دہلوی، صاف اور شستہ ہوتی ہے، قدامت کا رنگ زیادہ بھلکتا ہے۔ جس کو ہزیمت اور بڑا آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ آپ کے فسانوں میں عہدِ قدیم کی اسلامی معاشرت اور موجودہ خواتین کی معاشری اور سماجی اصلاح نظر ہوتی ہے۔ لیکن آپ کے فسانوں میں ایک عیب اور سخت عیب ہے کہ ٹریجڈی پیدا کرنے میں وہ حد درجہ غلو سے کام لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر و بیشتر غیر فطری صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اسی کے ساتھ دوسرا عیب یہ ہے کہ اُن کے فسانے

یکساں انداز کے ہوتے ہیں۔ اور ان میں کوئی تنوع نہیں ہوتا۔ نمونہ ملاحظہ ہو :-

”تم نے پڑھ لکھ کر، تعلیم کو بھی بدنام کیا۔ تم جیسی آزاد عورت سوسائٹی کے لئے باعث ننگ ہے۔ ڈپٹی صاحب۔ تمہارے والد، ابا جان کے دست ضرور تھے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ میں اپنی تمام ضروریات تمہاری خواہش پر قربان کر دوں۔ تم اپنے اس طرزِ عمل سے اپنی بہنوں کو سخت نقصان پہونچا رہی ہو۔ اور قدرت نے عورت کا جو اعتماد مرد کے دل میں پیدا کیا ہے تمہاری حرکات سے مجروح ہو رہا ہے۔ تم اپنے ساتھ اپنے صنف کی وقعت خاک میں مٹا رہی ہو“

”پانچ بجے کے قریب مرزا فخر کی حالت بالکل بدتر ہو گئی۔ حکیموں نے جواب دے دیا۔ تیمار دار خاموش ہو گئے۔ باپ جس کا کلیجہ پہلے ہی چھلنا تھا۔ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ فخر کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتا۔ اس کے قدم چومتا، منہ پر ہاتھ پھیرتا۔ سینہ کو بوسہ دیتا۔ اور الگ ہو کر چیخیں مارتا۔ اور پھر چپٹ جاتا۔ موت سے تھوڑی دیر پہلے جب بادشاہ کو پورا یقین ہو گیا کہ یہ عمر بھر کی کمائی لٹ رہی ہے۔ آنکھیں اس صورت کو ترسیں گی، اور کان آواز کو تراپیں گے، تو باواؤ بلند کلمہ طیب پڑھا۔ مرزا فخر پر مذہب اس قدر غالب تھا۔ یا اُسے مذہب سے اس قدر تعلق تھا۔ کہ شہر کے اکثر نہیں بیشتر آدمی اس کو وہابی کہتے تھے۔ وہ نذر و نیاز وغیرہ کا قائل تھا اور نہ اس قسم کے عقائد پر کار بند۔ مگر صوم و صلوة کا سختی سے پابند تھا۔ اور باوجود دولت و عزت، شباب و احباب کے درود و وظائف میں مصروف تھا“

”رات کے تین بجے، جب افروز، سلطان، کوکچہ سے چمٹائے۔ بے خبر پڑی سوئی تھی۔ دفعتاً سلطان کسمسایا۔ اور اس نے دو دفعہ ٹھٹھک کر، اونٹھ، اونٹھ کی۔ بچے کے ساتھ ہی افروز بھی اٹھ بیٹھی اور چکارنے لگی۔ اس وقت بچے نے رو کر نہیں۔ کچھ بسور گراماں، اماں کہا۔ ام کے ساتھ میم کی تشدید کو دونوں مرتبہ اتنا کھینچا کہ گھبرا گئی۔ کچھ آج سلطان کا رات کو اٹھنا۔ اونکھی بات نہ تھی وہ بارہا اٹھتا تھا۔ آج تو صرف ٹھٹھکا۔ ورنہ کئی دفعہ رویا، چیخا، چلایا، مچلا، مگر اس نے کبھی پانی پلا کر، کبھی سر سہلا کر سٹلادیا۔ اس وقت نہ معلوم، اس ام۔۔۔ ماں اور دونوں کے بیچ میں ایک اونٹھ کیا طاقت کھتی تھی۔ سر، پاؤں، ہاتھ، پیٹ۔ سینہ، سارا بدن لپیٹ گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ جوانی کی نیند، رات کا آخری وقت، برسات کے دن، بھونکے خود بھی آرہے تھے، مگر اس کی اذیت کے خیال سے نیند و نیند سب اڑ گئی۔ بچہ رواب بھی نہیں رہا تھا۔ مگر اسی طرح رک رک کر ام۔۔۔ ماں۔ ام۔ ماں کہہ رہا تھا“

”فرق بین یہ تھا کہ اس کا بخار اتر چکا تھا اس کو بخار چڑھا ہوا۔ اس پر طرہ، طارق ماشا اللہ پورا جوان، چیر و چار گھار و پانچ۔ فرزانہ غریب دھان پان، عمر بھر کی روگی، بارہ مہینے کی بیمار، جس کو گرمی دانہ بھی موت کا بہانہ تھا۔ وہ گھر کا

رہیں تھاتو یہ بھی کچھ گری پڑی نہ تھی۔ مانا کہ سردار پور میں طارق کا راج تھا، مگر فرزانہ بھی وہ عورت تھی جو سردار پور والوں کی لاج رکھ گئی۔ ایسی حالت میں طارق کا یہ حکم، کہ فرزانہ اٹھ کر پانی ہلائے۔ اور شہبانہ پاس سے اٹھ جائے سر اسزبجا تھا۔ مگر خدا کی مار ہندوستان کے اس طرز معاشرت پر، جس نے عورت کو لونڈی اور ماما سے بدتر بنادیا، بیمار، بیمار، دو دنوں ایک جیسا انسان وہ، ویسی انسان یہ۔“

س سجاد حیدر یلدرم

آپ اپنے ترکی افسانوں کے ترجمے کے لحاظ سے دنیا کے افسانہ میں ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ ترکی زبان و ادب میں آپ کا کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ آپ کی تحریروں اور ترجموں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ترکی ادب کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ آپ کے فسانے عموماً ترکی زبان سے ماخوذ و مختص ہوتے ہیں۔ طبعاً افسانے بھی آپ لکھتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی ترکی رنگ غالب ہوتا ہے۔ طرز بیان سلیس، عام فہم، دلچسپ اور لطف آگیاں ہوتا ہے۔ سادہ، صاف اور عام فہم عبارت میں جو دلکشی آپ کے یہاں پائی جاتی ہے وہ اور کسی کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ کردار نگاری بھی فسانوں میں نمایاں حقیقت رکھتی ہے۔ سلاست، روانی اور جوش کے علاوہ آپ کے بعض فسانوں میں مزاحیہ رنگ بھی جھلکتا ہے۔ چونکہ آپ طبعاً شاعر واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے عبارت میں بھی شعریت پیدا کر دیتے ہیں۔ فسانوں کو پڑھنے سے یہ امر بھی منکشف ہوتا ہے کہ آپ گرد و پیش کے حالات اور واقعات پر غائر نظریں ڈالنے اور ان سے نہایت اہم نتائج برآمد کرنے کے عادی ہیں۔ فطرت انسانی کا عمیق مطالعہ بھی آپ کے بعض کرداروں میں مستور ہوتا ہے۔ لیکن ترکی فسانوں کا ترجمہ کرنے میں ثقیل و غیر مانوس ترکیبوں سے آپ احتراز نہیں کرتے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

”دوسری حسین اور خوبصورت چیز، جس نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ وہ شمع تھی یہ نور عریاں مجھے گھنٹوں محو حیرت رکھتا تھا۔ اور کہیں قریب ہوا تو میں اس سے ملنے کے لئے بے اختیار، اس کی طرف بڑھتا تھا۔“ لیکن یہ کیا ہے؟ مجھے روکتے تھے کیوں؟ کیوں مجھے اس حسین شے سے ملنے نہیں دیتے تھے۔ اس لئے کہ پہلے کی طرح، ہر حسین شے، شفیق نہیں۔ یہ حقیقت۔ یہ دشمن حقیقت مجھے بعد میں معلوم ہوئی، اچھا ہوتا، جب ہی معلوم ہو جاتی۔“

”آجکل پردے کی سخت مخالفت چھڑی ہوئی ہے تمہاری اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ جدید خیال ہو یا کسے خیال ہو؟ کسے خیال ہوگے، کیونکہ پردہ کی مخالفت تو تم سے قیامت تک بھی نہیں ہونے کی؟“

میں نے کہا۔ ”بیشک، پردے کی مخالفت کون صاحب عقل کر سکتا ہے؟“

”تو پھر یہ شکایت بھی چھوڑ دیجئے۔ کہ ہماری زندگی میں دلچسپی نہیں“

”اسی کو پردے سے کیا تعلق؟“

”قیس کا باپ، اپنے ”دنیا کی نظر میں دیوانے“ بیٹے کی حالت سے مایوس ہو کر اجابت دعا کی امید میں مکہ آیا۔ وہاں آیا جہاں ہر شخص اپنی عزیز ترین تمنائے کر آتا ہے۔ اور جہاں، جس در کے سامنے، جس چھت کے چنچے، سب سے زیادہ صمیمی سب سے زیادہ دلی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ یا زیادہ صحیح یہ کہ ہر جگہ سے زیادہ قوی، امید اجابت کے ساتھ تخت سماوی کی طرف جاتی ہیں۔ (ورنہ صمیمیت تو دنیا کے ہر گوشہ میں فریادِ قلب کر رہی ہے، وہاں وہ اسے لے کر پہنچا۔ خود حضور و خشوع سے دعا مانگی اور قیس سے بھی کہا کہ اپنی قابلِ رحم حالت سے نجات پانے کے لئے دستِ دعا اٹھائے۔“

اور قیس نے دستِ دعا اٹھائے۔ اور انتہائی صمیمیت، غایت تضرع سے، اعماقِ دل سے نکلنے والی صدا سے دعا مانگی۔ مگر کیا؟ وہی جو اس نے سیکڑوں برس پہلے مانگی تھی۔ اور جو ہر قیس، طبیعت، چاہے وہ کہیں ہو اور کسی زمانہ میں ہو۔ مانگے گا۔ ”میں جس مصیبت میں مبتلا ہوں، خدا کرے وہ کبھی کم نہ ہو۔“

ق

قاری سرفراز حسین

آپ بھی ایک کتہ مشق فسانہ نگار ہیں۔ زبانِ سلیس، عام فہم، اور دلی کی ٹکسالی ہوتی ہے۔ اصلاحی رنگ نایاں ہوتا ہے، سوشل اور معاشرتی نقائص کو بخوبی بیان کر کے ان کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گردار نگاری سے خاص ذوق ہے۔ اور حتی الامکان ہر کردار کو اس کے فطرتی رنگ میں ظاہر کرتے ہیں۔ محاوروں کا استعمال اور شبہ و استعارات سے بھی عبارت کو سنوارتے ہیں۔ البتہ تحریر تاثیر سے یکسر معرا نظر آتی ہے۔ اور پڑھنے والے کے دل پر کوئی اثر نہیں چھوڑتی۔ پلاٹ دلچسپ ہوتا ہے۔ طوالت پسند بجد واقع ہوئے ہیں۔ اندازِ بیان میں ایک حد تک سو قیست بھی ہے، نمونہ ملاحظہ ہو:-

”کیا آپ پر پھر مجھے گناہ نگاری میں پھنسانے اور اس معصوم بچی کو بدنامی اور بے عزتی کے داغ کے ساتھ دنیا میں لاسنے کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ کیا آپ کے دین نے یہی تعلیم دی ہے۔ اور کیا آپ کے خاندان کی شرافت کا یہی مقتضائے ہے۔ کہ ایک معصوم بچی کو دنیا میں لا کر بالکل جوڑے میں چھوڑ دو۔ تم نے ذرا اس کی صورت تو دیکھی ہوتی۔“

7 نکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ ماتھا کیسا چوڑا ہے۔ ناک نقشہ کس قدر درست ہے۔“

”درازا ہی کے متعلق نہیں ہم جملہ فنون لطیفہ، مثل موسیقی، رقاصی، مصوری، سنگتراشی وغیرہ کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ اگر دنیا کی ذہنی ترقی انھیں لائوں پر ہوتی رہی جو ترقی کرتے والی دنیا کر رہی ہے تو خواہ نہ سب کتنی ہی مخالفت

کیوں نہ کرے جملہ فنون لطیفہ کا رواج پانا یقینی امر ہے۔“

دورِ ثانی

(الف)

اختر شیرانی

آپ نہ صرف شاعر ہیں، بلکہ فسانہ نگار بھی ہیں۔ اسی لیے آپ کی شاعری کا رنگ آپ کے فسانوں میں بھی جھلکتا ہے اور نہ صرف جھلکتا ہے بلکہ بہت حد تک آپ نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ آپ کی تحریروں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ”حسن و عشق“ کی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ تشبیہ و استعارات کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ایک ہی لفظ کو بار بار استعمال کرنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ یوں تو ایک لفظ کی تکرار عموماً (یا دہ) دہچسپ نہیں سمجھی جاتی، لیکن آپ ایک لفظ کو جب دو یا تین بار استعمال کرتے ہیں۔ تو طبیعت پر بار نہیں گذرتا۔ یہ بات ضرور ہے کہ طبعاً افسانے بہت کم ہوتے ہیں۔ عموماً مانو یا انگریزی اور عربی کا ترجمہ ہوتے ہیں۔ مگر ترجمہ بہت شستہ اور صاف ہوتا ہے اور بالکل اور بھل (طبعاً) معلوم ہوتا ہے تحریر کے مختلف نمونے ملاحظہ ہوں:-

”یونان۔ تاریخی عظمتوں اور اصنامی رفتوں سے لبریز یونان — کے آغوش عاطفت میں اس نے آنکھ کھولی۔ وہ دیویوں کی طرح حسین تھی۔ اور پھولوں کی طرح نازک۔ ستاروں کی مانند درخشاں تھی۔ اور پریوں کی طرح دلفریب۔ ہیلن کا، کافر ماجوس اور محشر طراد شباب۔ بالآخر رنگ لاکر رہا۔ محبت کے شریر حسین، مگر اندھے دیتا کی ایک دن اس پر نظر پڑ گئی۔ اور شاید بلا سوچے سمجھے اس نے ایک تیر، ایک دلگداز مگر لذت آفریں تیر، اس پر صرف کر دیا۔ جو معصوم ہیلن کے نازک دل میں گھر کرتا ہوا۔ سمندر کی دیوی کے تحت جگر، نوجوان شیل کے جگر میں جا پو بست

۱۹۱-۱۹۲

”اٹھو یا اخی! — آخر تمہاری نیند کبھی ختم بھی ہوگی۔؟ ذرا دیکھو تو تمام شہر میں کیسا ہنگامہ سا برپا ہے چاروں طرف لوگوں کے ہجوم بھاگتے نظر آتے ہیں۔ اٹھو۔ اٹھو جلدی کرو۔ اپنے بچہ کو لے کے بھاگو۔!“

”بھاگو۔ کہاں؟ کیوں؟ کیا بات ہے؟ کیا قاہرہ کو بھی قسطنطنیہ کی طرح آگ لگا دی جائے گی۔ ہمارے سر کوئی نیٹیکس منڈھا جائے گا۔۔۔۔۔ غضب خدا کا۔ قاہرہ کی تمام سراؤں کو چھوڑ کر یہاں آکر ٹھہرا تھا کہ یہ جگہ

”باب الفتح“ سے باہر ہے۔ یہاں تو ترکوں اور کردوں کے ظلم سے نجات ملے گی! — مگر —“

اعظم کرپوی

آپ کے فسانے دیہاتی معاشرت و تمدن کے علمبردار ہوتے ہیں۔ دہقانی زندگی کی صحیح روح اور معصوم کیفیات اپنے اندر مستور رکھتے ہیں۔ کردار نگاری میں بھی اچھا خاصا ملکہ ہے آپ انگریزی کے مشہور ناول نگار چارلس ڈکنس (Charles Dickens) کی طرح عموماً پست یا اوسط طبقہ کے افراد، کرداروں کے لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اور ان کو بہت خوبی سے بیان کرتے ہیں۔ پلاٹ بھی دلچسپ ہوتا ہے۔ اور زبان میں، عربی یا فارسی کے موٹے موٹے الفاظ کی بجائے سادہ، سلیس اور عام فہم ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ طوالت پسند نہیں ہیں۔ محاورے زیادہ اور تشبیہ و استعارات کم استعمال کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ ایک خاص نوعیت کے فسانے لکھتے ہیں جن میں بیشتر ترجمہ اور بہت کم طبعی اور ادبی ہوتے ہیں۔ آپ کی تحریر کے نمونے ملاحظہ ہوں

”بسنٹانے دانوں سے اپنی زبان دبا کر کہا۔“ ”نانا یہ تم کیسی بات کہہ رہے ہو؟“ تمھارا جو کچھ ہے وہ سب چنوا کا ہے۔ کھیت، مکان، سب پر اسی کا حق ہے۔ اس کا حق چھین کر زنگ میں نہ جاؤں گا۔ رام رام یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ رہ گیا بیاہ کا معاملہ تو میں اس سے دور بھاگتا ہوں۔ میں بیاہ کروں گا ہی نہیں۔“

بوڑھے نے مایوس ہو کر کہا۔ ”کیوں؟“

بسنٹانے دھان کوٹتے ہوئے جواب دیا۔ ”نانا تم بوڑھے ہو کر اتنی سی بات نہیں سمجھتے۔ بات یہ ہے کہ بیاہ ہوتے ہی میں تم کو برا یا سمجھنے لگوں گا۔ یہی میرے چچا پہلے مجھ کو بہت پیار کرتے تھے لیکن جب سے ان کا بیاہ ہوا اور ”چاچی“ آگئیں تب سے۔۔۔ اور کیا کہوں۔۔۔ اور کچھ ڈر نہوتا تو مجھے کچا ہی کھا جاتیں“

”لیکن رامانے ماں کا کہنا نہ مانا۔ اس وقت اس کے سامنے گزرا ہوا زمانہ تھا۔ پریمیا کی بچپن کی بے لوث محبت، اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اس نے ٹکسی سے سیدھا کی محالی منگوائی اور اُسی وقت درگا کے دروازہ پر پہنچ کر آواد دی۔ درگائے دروازہ کھول کر کہا۔ ”کون ہے؟“ رامانے جواب دیا۔ ”میں ہوں راما“

”ہمارے دھن بھاگ۔ آئے۔ اندر آئے۔ کیسے۔ آج اس طرف مالک کیسے بھول کر آگئے؟“ راماکے دل پر چوٹ لگی۔ اس نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ”ایشور جانتا ہے کہ میں گھر کے بار و بار میں پھنسا رہتا ہوں کہ کسی وقت فرصت ہی نہیں ملتی“

اس کا کچھ جواب نہ دے کر درگائے پریمیا کو آواد دی۔ ”بیٹی ذرا دیا جلا دے۔ مالک اندھیرے میں کھٹے ہیں“

”جگن کو آج تک کسی نے جگن بابا کو نہیں پکارا تھا۔ وہ فرطِ جوش سے بیتاب ہو گیا اور دوڑ کر دیوان جی کا پاؤں چھو لیا۔ مقررانے مہاراج کے قدموں پر سر جھکا دیا۔ اس وقت دیوان جی یا مہاراج کو اس بات کا خیال بالکل۔

نہیں تھا کہ چاروں نے ان کا پاؤں کیوں چھو لیا۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے یہ آنسو خوشی کے تھر رنج یا حقارت کا ان میں کوئی نشان نہ تھا۔ اس وقت پنج اور اونچ کا سوال نہ تھا یہ پریم ملاپ تھا۔ سمیٹا پاسی کے ساتھ ہی سب لوگ یکبارگی چلا اٹھے۔ ”جگن بابا کی جے!“

آغا حیدر حسن دہلوی

آپ دہلی کی نسائی زبان لکھنے میں بہ نسبت اور فسانہ نگاروں کے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور آپ کو عورتوں کے محاورات استعمال کرتے میں کافی دسترس حاصل ہے۔ اکثر واقعات تاریخ کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ روسی فسانوں کی طرح آپ کے فسانوں میں بھی پلاٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، کسی ایک واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے لیکن جو کچھ بیان کیا جاتا ہے مکمل ہوتا ہے۔ طرز ادا بے حد دلکش اور ساتھ ہی ساتھ نقادانہ ہوتا ہے۔ کردار نگاری کسی حد تک اور منظر نگاری زیادہ حد تک پائی جاتی ہے آپ کی تحریر کے نمونے ملاحظہ ہوں

”ساون کا مہینہ۔ بلا کا جس۔ کلو کو دھیانگی اٹھانے کی ملا توپ پڑی۔ پندرہ دن کا میل چو یا کرتا پسینے میں شور بشور۔ گریبان کھلا۔ بازوؤں تک آستین بتی ہوئی چڑھیں۔ ننگے سر، جوڑا بندھا۔ آٹا اگلا بی پانجامہ۔ مارے پسینہ کے جگہ جگہ دھتے پڑے۔ موریوں کہیں گھیر کہیں۔ پنڈلیوں پر کی نیچے کی سیون گھوم کر اوپر آئی۔ کان میں کندے کی ایک ایک بالی۔ جس میں سوکھے پھول مولسری کے بھرے۔ خیلہ خبیٹیوں کی سنی وضع، کارخانے پہ بیٹھی۔ سامنے بادلے کے تار تے۔ جھپا جھپ، جھپا جھپ ہاتھ چل رہا۔ اور دونوں پاؤں کے اُگوتھے باری باری سے اوپر، نیچے ہوتے جاتے۔ جیسے بھی ہو چراغوں جلے تک ٹپنے کا تھان اُتارے۔ کراتے میں، کھڑکی والی ہمسائی نے کوٹھے پر سے آواز لگائی ”وی بوا صد رحمت! بھلا یہ بھی کوئی کام کا دخت ہے“

”جب اس شہدین اور دھینکا مستی سے تھک کے ہلکان ہو گئیں۔ شربت کے لوٹے ڈال، پاک و صاف تھرے کپڑے پہن، دروں دالانوں میں جا بیٹھیں۔ چھت کی کھڑکیوں، بلیوں، قلابوں میں جھولے پڑے، کوئی تکیہ رکھ، کوئی پٹری، ان پر جاٹگیں۔ ننھی نیندانوں نے گانا شروع کیا

”ماں آڑو جامن کھلے دھرے۔ ماں میں نیں کھاتی میری ماں۔ ماں کپڑوں کی بچی کھلی دھری، ماں میں نیں پیتی میری ماں۔ ماں تتا پانی گرم دھرا۔ ماں میں نیں کھاتی میری ماں، ماں مستی کی ڈیا کھلی دھری، ماں میں نیں ملتی میری ماں، ماں سمدہ دانی کھلی دھری، ماں میں نیں لگاتی میری ماں، ماں ساجن آئے لینے کو۔ ماں میں نیں جلتی میری ماں“

امتیاز علی تاج

آپ طبع زاد افسانے شاد و نادر ہی لکھتے ہیں۔ طرز بیان سادہ، عام فہم اور سلیس ہوتا ہے جہاں تک میرے

مطالبہ کو دخل ہے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ تقریباً جتنے افسانے آپ کے اب تک شائع ہوئے ہیں۔ ان میں معدودے چند ہی طبعزاد ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر آپ کے کسی خاص طرز نگارش (Style) کا پتہ نہیں چلتا۔ چونکہ فسانے ترجمہ ہوتے ہیں اس لئے ان میں اصل مصنف کا رنگ موجود ہوتا ہے۔ طبعزاد افسانوں کی عبارت موثر اور کسی قدر لچپ ہوتی ہے لیکن پلاٹ بہت ہی معمولی اور دلچسپی سے خالی ہوتا ہے۔ کردار نگاری میں آپ کی نظر زیادہ وسیع نہیں معلوم ہوتی۔ آپ کی تحریر کے نمونے حسب ذیل ہیں

”اس طرح وہ انتقام اور خون اور قوت اور جنون کی دنیا میں سانس لے لے کر جوان ہوئی تھی۔ اور اُسے کبھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ اس کے مناسب اور بھرے بھرے جسم کی دلفریبیاں، ریشم کے رنگین اور باریک پیرہن میں کیا عالم افروز شعلہ بن کر بھڑک سکتی ہیں۔ اور معطر بستر پر، صرت اپنی دوشیزگی کے سوچ میں نیم دراز ہو جانے اور سیاہ اور رقیق آنکھوں کو جھپکالنے سے کیسی قیامتیں برپا کر سکتی ہے۔ اس کو جھپکنے اور شرمانے، مان لینے اور پسینہ پسینہ ہو جانے کی تعلیم نہ دی گئی تھی۔ اس کے باپ نے اس کے شباب کو لوہے اور شعلوں میں ڈھالا تھا۔ اور کچل دینے اور مسل ڈالنے کا سبق پڑھایا تھا۔ صحرا کے وسیع میدانوں میں اس کا بیقرار گھوڑا، ہنھناتا اور قبیلہ کے شمشیر آدماؤں کی تلواروں پر اس کی تلوار سے چنگاریاں جھڑکتی اور ہر روز، جب وہ اپنے کارناموں میں کسی تازہ فتح کا اضافہ کر کے گھر لوٹتی، تو اس کا باپ ایک فخریہ تہنم سے خود اس کو گھوڑے پر سے اتارتا۔ اور مسکرا کر اس کے کان میں کہتا۔ ”صحرا کا لڑکا اب چپ رہتا ہے۔ اور غیاور کا نام سن کر، اس کی زبان اپنے الفاظ بھول جاتی ہے“ اور پھر اس کی خون آلود۔ تلوار اس سے لے لیتا۔ اور پھر اس پر سے خون بونچھا کرتا اور اُسے اتنا چمکا دیتا۔ کہ اس کے دانتوں کا عکس اس میں نظر آنے لگتا“

اب ایک بھیاں تک خیال نے اس کے دماغ پر قابو پا لیا۔ میرے پاس دو لاکھ فرانک نوٹوں میں ہیں۔ بے ایمانی سے آئے سہی۔ ہیں تو میرے۔ اور میں انھیں نہیں لے سکتا۔ ان کے پیچھے پانچ سال کی قید بھگتی۔ اب انھیں چھو نہیں سکتا۔ نوٹ میری راہ تک رہے ہیں۔ ایک لفظ صرف ایک جو یاد نہیں آتا۔ مجھ میں اور ان میں دیوار بن گیا ہے“

پریم چند

آپ اردو کے چند بہت بلند پایہ فسانہ نگاروں میں ہیں۔ آپ کی تحریروں میں اور بھنبلی (Originality) اور جدت ہوتی ہے۔ طرز بیان، سادہ، سلیس، عام فہم ہونے کے علاوہ جادو کی طرح اثر کرنے والا ہوتا ہے پلاٹ نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہوتا ہے جس پر فسانہ کی تعمیر کی جاتی ہے۔ محاورے نہایت موزوں اور بر محل ہوتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارات بھی رنگین ہوتے ہیں۔ کردار نگاری میں مہارت تامہ حاصل ہے۔ عموماً دیہاتی زندگی اور معاشرت آپ کے فسانوں

کا مقصد ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس معاشرت اور اس زندگی میں جو نقائص ہیں ان کی اصلاح بھی مد نظر رکھتے ہیں۔ یہی آپ کے فسانوں کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مشرقی اور خصوصاً ہندوستانی تہذیب و تمدن کے پرستار معلوم ہوتے ہیں اور انھیں کو فسانوں میں بھی سراہتے ہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں

”کنور صاحب کے دل میں پنڈت جی کی طرف سے جو بدگمانی اور کدورت تھی وہ بہت کچھ سٹ گئی، مگر انھوں نے ہمیشہ سختی اور ظلم سے کام لینا سیکھا تھا۔ انھیں اصولوں کے وہ قائل تھے، انصاف اور سچائی اور ملائمت کی انھوں نے کبھی ادبائش نہیں کی۔ اور ان پر ان کا بالکل اعتقاد نہ تھا۔ مگر آج انھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ سچائی اور نرمی میں بڑی طاقت ہے“

”وسودھانے اسی انداز سے پھر پوچھا۔ ”اگر وہ تجھے بٹھا کر کھلاتا تب تو، تو اس کی دھونس سہتی“ گُنیا جیسے لڑنے پر آمادہ ہو گئی۔ بولی۔ ”بٹھا کر کوئی کیا کھلائے گا سرکار۔ مرد باہر کام کرتا ہے تو ہم بھی گھر میں کام کرتے ہیں۔ یا گھر کے کام میں کچھ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ باہر کے کام سے تو رات کو چھوٹ مل جاتی ہے۔ گھر کے کام سے تو رات کو بھی چھٹی نہیں ملتی۔ مرد یہ چاہے کہ مجھے گھر میں بٹھا کر آپ سیر سپائے کرتا پھرے تو مجھ سے تو برداشت نہ ہوگا“

”ماں ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”نہیں بابو جی۔ رہنے دیجئے۔ میں گریب (غریب) ہوں، لیکن بھکارن نہیں ہوں“

”یہ بھیک نہیں ہے۔ بچوں کی مٹھائی کھانے کے لئے ہے“

”نہیں بابو جی!“

”مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو“

”نہیں بابو جی۔ جس سے بیاہ ہوا۔ اس کی مر جا بھی تو میرے ہی ہاتھ ہے بھگوان تمھارا بھلا کریں۔ اب چلے جاؤ۔

نہیں دیر ہو جائے گی“

میں دل میں اتنا خفیت کبھی نہ ہوا تھا۔ جنھیں میں جاہل، کور باطن، بیخبر سمجھتا تھا اسی طبقہ کی ایک معمولی عورت میں یہ اعلیٰ خودداری، یہ فرض شناسی، یہ توکل۔ اپنے ضعف کے احساس سے میرا دل جیسے پامال ہو گیا۔ اگر تسلیم فی الاصل تہذیب نفس ہے اور محض اعلیٰ ڈگریاں نہیں۔ تو یہ عورت تعلیم کے معراج پر پہنچی ہوئی ہے“

جلیل قدوائی

آپ اردو کے وہ تنہا فسانہ نگار ہیں، جنہوں نے روسی طرز نگارش (Style) اختیار کیا ہے۔ اور یہ کہنامہ بالکل نہ ہوگا کہ آپ اس رنگ میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے "چیخوف" کا بہت عمیق مطالعہ کیا ہے اور "موپاساں" کا بھی۔ چنانچہ آپ کے طبع زاد فسانوں میں بھی۔ انہیں دونوں مصنفوں کا رنگ جھلکتا ہے

"جلیل اپنی کہانیوں میں چیخوف کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں" جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب: بی۔ اے مدیر "اردو" نے فرمایا ہے۔ اور یہ بالکل صحیح ہے پلاٹ ایک سرے سے مفقود ہوتا ہے البتہ کردار نگاری خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ طرز بیان، نہایت سلیس، سادہ اور عام فہم ہوتا ہے آپ کے فسانے بھی چیخوف کی طرح روزمرہ زندگی کے کسی خاص پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور ان میں مسرت اور غم دونوں شامل ہیں۔ آپ کے فسانوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی سے آپ کو خاص دلچسپی ہے اور آپ انسانی نظرت کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں "اُسے یاد تھا کہ اس کے باپ کے گھر میں کبھی ایک دیہات کی چڑیا کمرے کے اندر آ جاتی تھی اور باہر نکلنے کی کوشش میں، وہ شیشہ دار کھڑکیوں سے ٹکرائے کمرے کی تمام چیزوں میں انتشار اور گڑبڑ پیدا کر دیتی تھی۔ اسی طرح یہ عورت بھی، اس کی زندگی کے کمرے میں ایک غیر خاندان سے اڑ کر چلی آئی تھی۔ اور اس نے اس کے مکان عافیت میں ابتری پیدا کر رکھی تھی۔ اس کی زندگی کے بہترین ایام گویا۔ جہنم میں گزارے گئے تھے۔ اس کی حوصلہ اور مسرت سے بھری ہوئی اُمیدیں منہدم ہو گئی تھیں۔ اس کی تندرستی برباد تھی۔ اس کے کمرے، بے ترتیب، اور گڑبڑ پیدا کرنے والی فضا، طوائفوں کے کمروں کا نمونہ تھے۔ اپنی دس ہزار کی سالانہ آمدنی سے، وہ اپنی ماں کے لئے، جو ضعیفی کے ایام گاؤں میں کاٹ رہی تھی۔ دس روپے بھی نہ بچا سکتا تھا۔ اور پندرہ ہزار سے زائد اس کا قرضہ تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس کے گھر میں ڈاکوؤں کا ایک مستقل گروہ رہتا تو بھی اُسے اتنا نقصان نہ پہنچتا جس قدر بربادی اس نے اس عورت کے ہاتھوں اٹھائی تھی"

"کچھ قدم کے فاصلے پر وہ دیوار سے لگا خراٹے لے رہا تھا۔ اس کی ناک پر ایک چمچہ بیٹھا ڈنک مار رہا تھا۔ لیکن اُسے سوتے میں کچھ خبر نہ تھی۔ اس کا چہرہ بشاش معلوم ہوتا تھا شاید وہ خواب میں دیکھ رہا تھا کہ بستی کے تمام لوگ کھانسی میں مبتلا ہیں۔ اور اس کی دوکان سے دوا خریدنے آئے ہیں"

(ح) حامد اللہ افسر میرٹھی

آپ کے فسانے عموماً مانوذا اور ترجمہ ہوتے ہیں۔ طرزِ بیان عام فہم اور سادہ ہوتا ہے۔ مگر کوئی دلکشی نہیں ہوتی۔ پلاٹ کسی قدر دلچسپ ہوتا ہے لیکن کردار نگاری میں بہت نقص پائے جاتے ہیں۔ محبت کی چاشنی بھی عموماً ہر فسانے میں موجود ہوتی ہے۔ لیکن آپ کے فسانوں میں نہ تو کوئی جدت ہوتی ہے نہ آپ سماجی اصلاح مد نظر رکھتے ہیں، نہ زندگی کے کسی خاص فلسفہ کو بیان کرتے ہیں، یعنی روزمرہ زندگی کے واقعات سے اس قدر گھرے اور مفید نتائج نکالنے کی اہلیت نہیں رکھتے جو بعض اور فسانہ نگاروں میں موجود ہے۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

”آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے شراب پینی چاہیے، شاید اسی سے غم غلط ہو جائے۔ شاید میں خالدہ کو بھول جاؤں مگر یہ بھی میں نہ چاہتا تھا۔ میں تو اس تاریکی کو دور کرنا چاہتا تھا۔ جو میرے حواس پر مسلط ہو گئی تھی۔ خالدہ سے اگر مجھے محبت تھی۔ تو اس محبت کو میرے دل کے لئے ذریعہ شادمانی و مسرت بنانا چاہیے تھا۔ پس میرے موجودہ رنج و ملال کا سبب خالدہ کی محبت نہ تھی، بلکہ نعم کی رقابت اور چچامیاں کے انکار سے اپنی تذلیل کا احساس تھا ان دونوں چیزوں کا اثر ذلیل کرنا ضروری تھا اور مجھے پختہ یقین تھا کہ شراب مجھے اس مصیبت سے نجات دلائے گی“

”اس وقت ان کا سارا بدن لرز رہا تھا۔ آنکھیں اُبل آئی تھیں منہ خشک ہو کر کھل گیا تھا، ایسی عجیب سیٹ کس کی نظر اپنی طرف نہ کھینچ لیتی۔ اب گاڑی پانچ سے گزر چکی تھی۔ اور گزشتہ شب قتل کا واقعہ پانچ اور ہاپوڑ کے درمیان ہی ہوا تھا۔ درجہ کا دوسرا مسافر ذرا سنبھل کر بیٹھا۔ بیگ کھول کر اس میں جھانکا۔ پھر بیگ بند کر دیا۔ داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اس وقت گنیش بہاری کے حواس قطعاً معطل ہو چکے تھے، انھیں چند منٹ سے زیادہ اپنی زندگی کی امید نہ تھی وہ ہر لمحہ اس انتظار میں تھے کہ اب کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکال کر میری روح کو تن سے جدا کیا جائے گا“

(خ) خواجہ مسعود علی ذوقی بی۔ لے

”آپ کے تمام افسانوں میں اور پینیلی ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر اپنے ہی واقعات اور مشاہدات بیان کرتے ہیں پلاٹ عموماً دلچسپ ہوتے ہیں۔ فسانوں میں روزمرہ زندگی کے ساتھ ساتھ سوسائٹی اور معاشرت پر نقادانہ نظر ڈالتے ہیں۔ طرزِ بیان بہت دلکش ہوتا ہے کردار نگاری کی طرف بھی خاص توجہ رکھتے ہیں۔ آپ کے فسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت منظر کشی ہے۔ ہر موقع اور مقام کو اس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے اصل چیز، اصل موقع اور مقام پھرنے لگتا ہے، محاورات اور تشبیہات سے بھی عبارت کو رنگین بنانے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

”اس کے علاوہ، آزادی، انسان کا پیدائشی حق ہے، خواہ وہ روحانی آزادی ہو۔ خواہ جسمانی، خواہ مذہبی، اچھا اسے جانے دیجئے۔ یہ جو عجیب و غریب قانون تراشے گئے ہیں۔ کہ فلاں مذہب کے لوگ صرف فلاں مذہب کے لوگوں سے شادی کر سکتے ہیں۔ یہ بھی کتنی مہمل اور لغو بات ہے۔ میرے نزدیک تو یہ رکاوٹ سراسر ظلم ہے۔ ایسا ظلم، جسے کھینچ تان کر مذہبی اصول کے حدود میں گھسیٹ لیا گیا ہو۔ یہ خیال کرتے کرتے، مجھے ہندو مسلمانوں کی موجودہ خانہ جنگیوں پر ایسا شدید صدمہ ہونے لگا جیسے کسی نے تان کر دل پر زور سے گھونرہ رسید کر دیا ہے۔ ان جھگڑوں پر میرا دل ہمیشہ دکھتا تھا۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ جتنا سنج مجھے اس وقت ہوا۔ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا“

”میں نے زہری لیا ہے“ اسد نے جھنجھلا کر کہا۔ ”مجھے اس کمرہ میں تنہا چھوڑ دو۔ خدا کیلئے مجھے سکون اور اطمینان سے مرنے دو“ اسد کی بیوی کے چہرہ پر سفیدی چھا گئی۔ وہ اپنے بال نوچتے ہوئے دہڑام سے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ چھوٹے بچوں نے کبل کی تہوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ طلعت اور احمد صدمہ کی وجہ سے اپنے باپ کی چار پائی پکڑتے ہوئے، گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑے۔ اماؤں اور چھو کروں نے ڈھاریں مار مار کر سارا کمرہ سر پر اٹھا لیا۔ عین اسی وقت جبکہ یہاں یہ ہنگامہ برپا تھا۔ برآمدہ کے پتھروں پر فوجی بوٹ کے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی اور ایک لمحہ میں ایک لائبرٹرائنگ، مضبوط اور تنومند جوان، جو فوج کی پوری وردی پہنے ہوئے تھا، چاندی کی شام کا ایک چھوٹا سا بید ہلاتا ہوا، بے پروائی کے انداز میں اندر داخل ہوا، اسے دیکھتے ہی اسد کی بیوی لڑ کھڑاتی ہوئی اٹھی اور دوڑاؤ ہو کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی

”انھوں نے زہری لیا ہے“ اس نے رورور کر سکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”انھوں نے اپنی جان دینے کی ٹھان لی ہے۔ دیکھو میں نہ کہتی تھی۔ انکے ہوش و حواس ٹھیک نہیں۔ لبتا انھیں بچاؤ۔ شاہد بھائی، ڈاکٹر۔ کسی ڈاکٹر کو بلاؤ“

”اسی کے عہد میں ایک پرغور فلسفی کی طرح عورتوں کی ناقص تعلیم کے اسباب علل پر نظر ڈالنے لگا۔ پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس میں بیماری عورتوں کا کیا قصور ہے۔ ساری خطا تو ان تاریک خیالات مصیبتوں کی ہے جو اپنی عورتوں کو صحیح تعلیم و تربیت دلانے بجائے انھیں پالتو چڑیوں کی طرح گھر کے پنجروں میں بند رکھتے ہیں کیا انداز ہے کہ صالت کے ہاتھوں سیکڑوں بے تکے رواج روز بروز پیدا ہوتے جائیں لیکن کوئی کروٹ تک نہ لے“

رہنما اجمیری

آپ عہد حاضر کے نوجوان فسانہ نگاروں میں اچھے اور کامیاب فسانہ نگار ہیں۔ یعنی آپ کے فسانوں میں ”افسانویت“ زیادہ مد تک پائی جاتی ہے۔ فسانوں کے پلاٹ بہت دلچسپ اور خصوصاً نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ آپ کا طرز بیان دلکش اور موثر ہوتا ہے۔ عبارت علم فہم ہونے کے ساتھ ساتھ رنگین و بے لبریز ہوتی ہے جدت آپ کی سرشت میں پائی جاتی ہے۔ اور اس لحاظ سے ہر فسانہ کسی نہ کسی ”جدت“ کا ضرور حامل ہوتا ہے اور پختگی کے لحاظ سے بھی آپ بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ کردار نگاری میں آپ کو خاص ملکہ ہے۔ آپ کے فسانے تمام تر مشرقی

جذبات و تمدن اور تہذیب سے معمور ہوتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارات کثرت سے استعمال کرتے ہیں لیکن یہ کثرت لطف سے خالی نہیں ہوتی۔ فارسی اور اردو اشعار سے عبارت میں شعریت پیدا کرتے جاتے ہیں۔ طرز بیان میں تنوع پایا جاتا ہے۔ اور آپ کے تقریباً تمام فسانے اپنے اندر ”حسن و عشق“ کے مناظر مستور رکھتے ہیں۔ مگر اس ”محبت“ کے پردہ میں آپ زندگی کے بڑے بڑے فلسفے اور رموز بیان کر دیتے ہیں۔ جن میں اصلاحی عنصر بھی جھلکتا ہے۔ مجموعی طور پر آپ کے فسانوں کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ ایک خالص مشرقی فسانہ نگار ہیں۔ جو نہ صرف مشرقی تہذیب و تمدن کا شہید ائی ہے بلکہ اس کی تبلیغ بھی کرنا چاہتا ہے۔ اکثر فسانوں میں اشتراکیت کی حمایت کرتے ہیں۔ اور زہر پرستی کے خلاف احتجاج بھی ہوتا ہے

ایک اور خصوصیت آپ کے افسانوں میں ”تکرار“ ہے اور اس ”تکرار“ میں آپ جو لطف پیدا کرتے ہیں، وہ قابل ستائش ہے۔ ہندوستانی ”فلسفہ محبت“ کو جس خوبی سے بیان کرتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ منظر کشی پر بھی کافی عبور حاصل ہے۔ آپ کی تحریر کے مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

”عشق و محبت کے واقعات اکثر و بیشتر رشتہ داروں ہی میں ہوتے ہیں۔ عام طور پر چچا زاد، خالہ زاد، بہن بھائیوں میں پردہ نہیں ہوتا۔ اور اصلی خرابی کی بنیاد یہیں سے پڑتی ہے ”محبت بہ یک نظر“ کی شاذ و نادر صورت کو چھوڑ کر، عموماً محبت، روزانہ کے میل ملاپ، نشست برخاست، دید باز دید سے بڑھتی ہے۔ اور پردہ ریش پاتی ہے اور یہ موقع صرف عزیز داری کی صورت میں میسر آسکتا ہے۔ اگر سوسائٹی محبت کو ایسا نحیف جرم سمجھتی ہے تو اسے چاہئے کہ ان عزیزوں سے سخت پردہ کا قانون رائج کرے۔ ممکن ہے، یہ رائے اس زمانہ میں، جبکہ خود پردہ ہی اعتراض کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، عجیب معلوم ہو، لیکن اگر محبت کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ تو پھر یہ پابندی سخت ناگزیر ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ نہ یہ پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ نہ محبت کی اجازت ملتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محبت ہوتی ہے اور خوب ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اس محبت میں سوائے ناکامی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے دو معصوم زندگیاں ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں۔ زمانہ کی ہوا بدل رہی ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں جدید تعلیم سے بہرہ یاب ہو رہی ہیں۔ تعلیم نے ان کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچا دی ہیں۔ سوسائٹی نے یہ اجازت تو دیدی ہے لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ محبت کا راستہ ابھی تک ان کے لئے مسدود ہے“

”دو معصوم شرارت مآب آنکھیں، لبوں کا ایک شوخ ترسم، بشرہ کا نرم خوردہ انداز۔۔۔ اور تقیم کے سینے میں دفنہ ایک ہنگامہ خیز، پچل چم گئی۔ اس کے تمام سوئے ہوئے حسیات ایک دم سے بیدار ہو گئے۔ بھرپور اٹھے۔ افق خیال پر دو آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں، ہونٹ قاتل انداز

میں سکر رہنے تھے۔ اور دنیا کے سارے شور و غل کو سکوب مطلق میں تبدیل کرتی ہوئی یہ آواز آرہی تھی ”واہ اب یہ میرا ہو چکا“ آفتاب کی تمازت، فضا کی تپش، گاڑیوں کی گھڑ گھڑاہٹ، راہروؤں کی گفتگو، خرید و فروخت کی جھج پھکار، سڑک کا شور و غل، اور پھر آخر میں دفتر کی خاموش فضا، سب مل کر، سب ایک ہو کر، ایک ہی مختصر جملہ بناتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ”واہ یہ اب میرا ہو چکا“

”صد حیف“ حاد نے مزاحیہ سنجیدگی سے قطع کلام کیا۔ ”وہی سرمایہ پرستی، خدائے زر کی پرستش، بنائے کعبہ کی دھادینے پر آمادہ ہوتی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری دنیا میں سب سے بڑی لعنت ہے، اسی نے بندہ و خواجہ، غریب و امیر، مزدور و آقا، شریف و ذلیل کا فرق پیدا کیا ہے۔ اور ایک انسان کو اُس کے ہی جیسے دوسرے انسان پر، برتری دیدی ہے، حالانکہ بارگاہِ خداوندی میں ”نمود و ایاز“ دونوں کو ایک ہی درجہ حاصل ہے۔ دنیا کی ساری خرابیاں اسی سرمایہ نے پیدا کی ہیں“

(دیں)

سُدرشن

آپ کے فسانے تمام تر طبع زاد ہوتے ہیں۔ بلاٹ بنانے میں سادہ رکھتے ہیں معمولی سے معمولی فسانے کا بلاٹ، دلچسپ اور لطف آمیز ہوتا ہے اندازِ بیان بہت سادہ اور عام فہم ہوتا ہے۔ روزمرہ کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ عبارت میں رنگینی یا دلکشی نہیں ہوتی، نہ مؤثر ہوتی ہے۔ الفاظ کے انتخاب پر زیادہ توجہ نہیں کرتے۔ بعض اوقات ہندی اور سنسکرت کے بہت موٹے موٹے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جو عام فہم نہیں ہوتے۔ کردار نگاری بہتر ہوتی ہے۔ عموماً سوشل و معاشری فسانے لکھتے ہیں۔ دیہاتیوں کی غلط اُردو کا بھی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ ایک نقص جو آپ کے فسانوں میں نمایاں ہے وہ یہ کہ اکثر فسانوں میں قومی تعصب کا رنگ نظر آتا ہے۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

”گجراتی نے لٹی، چاول اور گنڈیریوں سے چاند کو راگھ دیا۔ اور دونوں ہاتھ باندھ کر صدقِ دل سے شوہر کی سلامتی کے لئے پُرا رتھنا کی۔ اس وقت اُسے چاند مسکراتا ہوا دکھائی دیا۔ جیسے اُسے اشیر باد دے رہا ہے۔ جیسے اس سے کہہ رہا ہے۔ تم ناحق گھبرا رہی تھیں۔ اب گجراتی کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہوا میں تیر رہی ہے۔ اس کے منہ سے ہنسی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی تھی۔ گجراتی سوکتی تھی، مگر ہنسی رکتی نہ تھی“

”کھوشیا نے آنکھیں سجا کر کہا۔“ ڈاکو معلوم ہوتا ہے۔ دیکھ لینا کسی دن گر پتار ہو جائے گا۔“ چودھری حقہ پی رہا تھا۔ کھانستے ہوئے رونقی کی طرف چلم بڑھا کر بولا۔ ”یہ تمہاری کھام کھیالی ہے آدمی بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ جرور بھاگو ان ہے

اپنے کام سے ادھر آنکلا ہے چار دن رہ کر چلا جائے گا۔

روشنی نے چلم پر کولہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ”برانہ ہوتا تو آتے ہی اس چھوکری کا منہ کیوں باندھ دیتا۔ ہمارا منہ تو کسی بھڑوسے نے نہ باندھ دیا۔ کھو بصورت منہ دیکھ کر پھسل پڑا۔“

سلطان حیدر جوش

آپ کے فسانے عموماً طبع زاد ہوتے ہیں۔ پلاٹ دلچسپ اور عبارت بہت بلند پایہ ہوتی ہے طرز بیان نہایت نگین اور بعض وقت بہت دلکش ہوتا ہے۔ محاورات اور تشبیہات کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ عربی اور فارسی ترکیبیں زیادہ اور انگریزی ترکیبیں بھی ہر فسانے میں موجود ہوتی ہیں۔ جا بجا اردو اور فارسی شعر لکھ کر مفہوم ادا کرنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ فسانوں میں، سیاسیات پر بھی ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں۔ کردار نگاری میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ مشکل نگار واقع ہوئے ہیں۔ عام فہم اردو نہیں ہوتی۔ نمونے ملاحظہ ہوں

”سلیم اور جانشی میں، محویت شباب کے علاوہ کوئی چیز مشترک تھی تو صرف یہ کہ دونوں تعلیم یافتہ تھے۔ اور دونوں مذہب کی ظاہر پرستی سے متنفر ایک قد آور سخت گیر اور سیما ب طبع نوجوان تھا۔ تو دوسری سبک اندام، نکی لٹس اور کم سخن نازنین۔ ایسی دو شخصیتوں کا اتصال مستقل، حلقہ احباب و تعارف میں، اجتماع ضدین سمجھا جاتا تھا۔ مگر میکدہ حجاز کو، ترتیب دینے والا ساقی احسن، ہمیشہ عقل آرائی کے تانے بانے کو محض ایک جرعہ جذبات مخور سے، تار عنکبوت کی طرح توڑ ڈالنے کا عادی و عامل رہا ہے۔ سلیم نے ہمیشہ کے لئے جانکی کو اپنی آغوش شوق میں لے لیا۔ اور جانکی بلاتامل اس کے سینے سے پیوست ہو گئی۔“

اس اجمال کی تفصیل میں، ایک تحقیقاتی کمیشن کی خدمات حاصل ہو جانے پر بھی ایک مالوی پنڈت اور لاہوری میا کے باہم دست و گریباں رہنے کا شبہ قوی باقی رہے گا۔ مختصر یوں سمجھئے کہ جس طرح آفتاب کی شعاع شبنم کو چُن لیتی ہے اسی طرح سلیم اور جانکی بھی باہم گر پیوست ہو گئے۔ یہ بھی تشفی بخش نہ تو سلیم اور جانکی کے اتصال پر ہز بانس آغا خان یا سٹر محمد علی جناح کی رائے طلب کی جاسکتی ہے۔ فی الحقیقت اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ یہ پیر پروانہ شاید بادبان کشتی اے تھا۔ ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی

”کیا اسی زائل ہو جانے والی خواہش نفسانی کو تم محبت کہتے ہو؟ کیا اسی ایک معمولی سے ہوا کے جھونکے سے ٹھنڈا ہو جانے والے ٹٹھاسے ہوئے چراغ کو تم شعلہ محبت بناتے ہو۔ غلط بالکل غلط۔ محبت وہ درد ہے جو کسی دوا سے بھی زائل نہیں ہو سکتا۔ محبت وہ کشش ہے جو عامل تک کو، قوت کشش میں جذب کر دیتی ہے۔ یہ وہ جیتی جذبہ ہے جو ہر مافی اور جسمانی قوت کو سلب کرنے کے ساتھ، حبیب کو محبوب اور محبوب کو حبیب بنا کر بھی کم نہیں ہوتا۔ اپنی زوال پذیر خواہش

اور چشمِ زدن میں معدوم ہو جانے والے جوش کو محبت نہ کہو، یہ محبت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

(ع)

(میاں) عبدالعزیز (فلک پیا)

اُردو فسانہ نگاروں میں، جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ہی ایک وہ واحد فسانہ نگار ہیں، جن کی تحریروں اور فسانوں میں فلسفیانہ رنگ زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اور آپ جو کچھ تحریر فرماتے ہیں وہ بہت غور و تحقیق کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، فسانوں میں پلاٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ صرف واقعات اور کردار نگاری قابل ذکر ہوتی ہے، ہر کردار کو فلسفی اور ہر بات کو فلسفیانہ طرز سے بیان کرتے ہیں۔ ٹیگور کا رنگ بھی کہیں کہیں موجود ہوتا ہے، عبارت سادہ اور سلیس ہوتی ہے۔ لیکن ان کا مطلب اکثر پیچیدہ ہوتا ہے اور اس لئے عام فہم نہیں ہوتا۔ جو کچھ تحریر فرماتے ہیں کسی خاص مقصد کے تحت ہوتا ہے اور اس سے عوام الناس کو نصیحت دینا منظور ہوتا ہے، انگریزی طرزِ نگارش زیادہ غالب نظر آتا ہے اکثر اوقات بعض مطالب کو ادا کرنے کے لئے اُردو کے بجائے انگریزی الفاظ بھی استعمال کرنے سے عار نہیں کرتے، اس سے عبارت میں ایک بدنمائی پیدا ہو جاتی ہے، افسانوں میں عموماً اصطلاحی اور معاشرتی پہلو کو لیتے ہیں، اور نقائص کو بیان کر کے ان کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، خیالات بہت عمیق ہوتے ہیں۔ زبان اکثر پنجابی ہوتی ہے۔ نمونے ملاحظہ ہوں

”جب دوسرے قریادی نے شہزادی کا یہ حکم سنا تو وہ شہزادی کے پاؤں پر گرا اور اس نے عرض کی۔ کہ جان کی امان ہو تو تمام واقعہ بلا کم و بیش عرض کر دوں۔ پھر جو حضور کا مزاج چاہے حکم دیں۔ شہزادی بولی کہ اچھا تم اپنا قصہ کہو۔ امیر نے عرض کیا کہ حضور میری ایک ہی بیٹی ہے۔ جو ہر طرح عقل میں، شکل میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ میں سفر میں اس کو ہمراہ لے گیا۔ اور اس آدمی کے ملک میں پہنچا۔ وہاں اس نے اور اس کے لڑکے نے ہماری نوکری کی۔ اور ہم ان دونوں کو ساتھ لے آئے۔ وہ لڑکا اگرچہ غریب ہے۔ مگر اس قدر شریف ہے کہ میری بیٹی کے دل میں اس کی محبت ہو گئی ہے۔ اور میں بھی سچے دل سے خوش ہوں۔ کہ یہ عقد ہو جائے۔ مگر یہ شخص نہیں مانتا۔ آخر میں اُسے دربار میں چوری کے الزام پر گھسیٹ لایا۔ اس کا عذر ٹھیک ہے۔ کہ میں نے اس کی اجرت ادا نہیں کی۔ اس کا بیٹا ایسا سعادتمند ہے کہ باپ کی اجازت کے بغیر وہ نکاح کرنا پسند نہیں کرتا۔ دوسرا عذر اس کا یہ ہے کہ وہ شادی تب کرے گا جب وہ کافی دولت کمائے گا۔“

”میں۔ (درمکی طور پر) بندہ پرور، اللہ مجھ سے تو ایسے الفاظ نہ کہئے۔ بزرگوں سے جو آپ کی مراعات تھیں۔ وہ میرے دل پر نقش ہیں۔ اوز کا فر ہو جو یہ جانے کہ آپ کا وقت پورا ہو چکا۔ ابھی تو ہندوستان میں صدیوں آپ کا ڈنکا بجے گا۔“

خیرات :- آپ ہم مسکینوں سے یہ رسمی جملے استعمال نہ کریں ہمارا جنازہ آج نہ نکلا تو کل نکلے گا۔ آپ سے عرض کرنے کا مدعا صرف اس قدر تھا

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

خدا کی شان کہ خود آپ بچپن میں ہم سے کھیلے اور اب یہ بیگانگی کہ مغربی تہذیب کے دام تزویر پھیلانے جاتے ہیں کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میں :- معاف کیجئے۔ واقعی آپ کی حالت قابلِ رحم ہے۔ قوم کی احسان فراموشی کی آپ زندہ تصویر ہیں مگر آخر یہ تو فرمائے کہ قوم بچاری خلافت دالوں سے طلاق لینے کے بعد سیدھی تبلیغ تنظیم دالوں کے گھر جا پڑی۔ اور وہ لوگ پیسے کے پیر ہیں۔ اب آپ کے لئے رقم آئے تو کہاں سے ؟

پیری مریدی :- تو گویا آپ کی طرف سے صاف جواب ہے

”ہاں اللہ میاں تو بات یہ تھی کہ میں نے کہیں کہہ دیا کہ مجھے تو پڑانا بوسیدہ صدیوں کی ذمہ دار تلے دبا ہوا۔ خدا درکار نہیں۔ بلکہ میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ سکند ہینڈ *Second hand*، کپڑا پہن لیں مگر سکند ہینڈ خدا ہرگز نہیں۔ تم تو بالکل ٹو جو ان ہونا اللہ میاں ؟ کس قدر یہ لوگ باتیں بناتے ہیں کہ تم وہی ہو جو تھے۔ اتنا نہیں سوچتے کہ جس میں خدا ہو کر بھی شباب نہ ہوا سے خدائی کا کیا مزہ ؟ اللہ میاں کیا کہا کہ مجھے اس گستاخی کے بدلے پھونک دو گئے ؟“

”اے دوست !

سورج اور تاروں کا، چاند اور بادلوں کا تو ذکر کر دوں۔ مگر زبان کہاں سے لاؤں ؟ کس خلوص، کس تپاک سے فطرت کے یہ معجزے انسان کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں ان ثقافت میں کیا رعنائی ہے ؟“

اے دوست !

کیا تم نے سورج کی *Courtesy* پر کبھی غور کیا ہے۔ سورج میرا استاد ہے تو چاند میرا بھائی ہے گھٹنے بڑھنے کا لگہ نہیں۔ جیسے نور اور سایہ برابر ہیں۔ استاد کو یا بھائی کو ترقی کی فکر نہیں، تنزل کا غم نہیں اور ہولہ کیوں ہوا ؟ جو اپنے کام پر مستعد ہیں غم فردا ان کی بلا کو

ل

لطیف الدین احمد دل-احمد

آپ کے فسانے بیشتر ترجمہ ہوتے ہیں اور کمتر طبع زاد۔ آپ کے ترجمہ ”لالہ رخ“ نے ”دنیا کے فسانہ نگاری میں“ آپ کو دائمی شہرت بخش دی ہے۔ اس کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ آپ میں زبان دانی اور ادب فنی کی اہلیت کس قدر ہے۔ آپ کے ترجمہ فسانوں سے اس امر کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ زبان اردو باوجود اپنی بے بضاعتی کے غیر زبانوں کی تصانیف کو ان کے حقیقی مفہوم میں ادا کرنے کی کہاں تک اہل ہے۔

آپ کا طرز بیان، بہت بلند پایہ بہت لطیف، بہت دلکش اور بید رنگین ہوتا ہے تحریر میں جدت اور کردار نگاری بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ پلاٹ بھی دلکش اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ تشبیہات اور استعارات کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ کثرت لطف اور دلچسپی سے خالی نہیں ہوتی۔ چونکہ ترتیب اور بندشیں زیادہ تر فارسی اور عربی طرز کی ہوتی ہیں۔ اس لئے عوام الناس آپ کے فسانوں سے زیادہ لطف اندوز اور مستفید نہیں ہو سکتے مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

”ہنوز وہ اسی فکر میں تھی کہ اس کی نظر خطہ ہندوستان پر پڑی جہاں کی ہوائیں رُوح افزا ہیں۔ جس کے سمندر کی گہرائیوں میں عنبر کا فرش ہے۔ اس کے ساحلوں کی دیواریں مونگے کی ہیں۔ جہاں شعاع خورشید میں غسل کرنے والے پہاڑوں کے نیچے ہیرے کی کانیں جگمگاتی ہیں۔ اور جس کے چشمہ ہائے رواں کی موجوں میں سونا حل کر دیا گیا ہے۔ لیکن آج اس کے دریاؤں کا رنگ قرمزی ہے انسانی خون سے چشمے رنگین ہو رہے ہیں۔ اور باغات سے اس وقت موت کی بو آ رہی ہے۔ اور ہر اس سانس میں جو سطح زمین سے بلند ہو رہی ہے انسانی قربانی کی بو شامل ہے۔“

”مشرافت و انسانیت، اُمید ورجا کے جو جذبات ایک زمانہ سے اس کے اندر نیم مردہ حالت میں تھے۔ دفعتاً بیدار ہو جاتے ہیں۔ جو شش گریہ سے اس کی آواز بلند ہو جاتی ہے وہ روتا ہے۔ اور آنسوؤں کا ایک طوفان جاری کر دیتا ہے۔ جو آنسو عمیق دل سے ندامت گناہ میں نکلے ہیں بے شہ مقبول ہوتے ہیں۔ ایسی ہی قبول اور عفو طلب دانی اشک میں ایک خاص قسم کی طمانیت کا اولین احساس ہونے لگتا ہے۔ اور یہ احساس ایک گنگارہی کو ہو سکتا ہے۔“

”ایک فوارہ موسیقی نواز میرا مسکن ہے اور شب ماہ کے طرہ ہائے گل نے مجھے یہاں کھینچ بلایا ہے۔ ایک چشمہ میرا ماں ہے۔ جہاں میں صبح و شام۔ اور روز و شب۔ امواج ترنم کے اندر راحت پذیر رہتی ہوں۔ جہاں کی ہوائیں بانسریوں کی لے سے ملی جلی ہوتی ہیں۔ جہاں ہر وقت بارش نعمات ہوتی رہتی ہے۔ اور جہاں دل سے نکلنے والی ہر آہ ہونٹوں

سے جدا ہو کر گیت بن جاتی ہے۔“

”بھانگیر، الم زدہ بھانگیر، ان شرابیوں کے جامِ پیہم پی رہا ہے، کثرتِ مینوشی سے اپنے خلائے دل کو پُر کرنا چاہتا ہے کہ یہ سیلابِ ناب، اس کے دل میں اس درجہ طوفانِ خیز ہو جائے کہ پھر وہاں طائرِ محبت کی پرداز کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے، مگر اس نے شاید بھلا دیا ہے۔ کہ محبت کا شریر دیوتا تو ساغرِ مے کی لہروں پر بھی شناوری کرتا اور انھیں اقسامِ دائمی سے تجلی ریز بنا دیتا ہے۔“

”مپیو نے مزارِ آبی کے اندر اپنے عشقِ ناکام کی سوزش و التهاب سے تہاہ لینے کی ٹھان لی، سان تھین کی شادی کی خبر سن کر ماتی کے جذبات و محسوسات کا تجزیہ تو دشوار ہے۔ لیکن جب مپیو نے اس پر اپنے عزمِ دارادہ کا اظہار کیا تو وہ مپیو سے لپٹ کر رونے لگی، اور جیسے وہ پہلے ہی سے فیصلہ کے بیٹھی تھی مصر ہوئی کہ جس طرح وہ اس کی شریکِ مرث اور شریکِ غم رہی ہے، شریکِ مرگ بھی ہوگی۔“

(۴۰) مجنوں گور کھیوری

آپ کے فسانے عموماً انگریزی اور خصوصاً ٹامس ہارڈی کے فسانوں کا چربہ ہوتے ہیں۔ طبعِ افسانے بھی آپ لکھتے ہیں۔ زبان عام فہم اور سادہ ہوتی ہے اور طرزِ بیان بہت دلکش ہوتا ہے۔ کردار نگاری میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ اور ہر افسانہ میں ہر کردار کی خصوصیتوں کے اظہار میں ابتداء سے انتہا تک بہت توجہ سے کام لیتے ہیں۔ پلاٹ بہت دلچسپ بناتے ہیں۔ طوالت پسند ہیں۔ کوئی فسانہ ٹامس ہارڈی کے رنگ سے معرا نہیں ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹامس ہارڈی کے فسانوں اور ناولوں کا مطالعہ آپ نے بہت عمیق نظروں سے کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے خیالات اور اس کا فلسفہ زندگی آپ کے خیالات میں سرایت کر گیا ہے۔ ہر فسانے میں فلسفہ زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور عشق و محبت کے مناظر، پیش کرنے کے عادی ہیں لیکن عشق و محبت کے اندازِ بیان میں مغربی رنگ غالب ہوتا ہے۔ چونکہ ٹامس ہارڈی ”مصورِ غم“ مانا جاتا ہے اس لئے آپ کے فسانوں میں بھی غم کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ بد نصیبی، حسرت و یاس، ناکامی اور دردِ مندی کے دلگداز واقعات آپ کے فسانوں کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ اور ان میں تاثیر موزن ہوتی ہے۔ جو ہر دل کو کرداروں کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ آپ کے یہاں جدتِ مفقود ہے۔ تقریباً ہر فسانے کا پلاٹ ابتداء سے انتہا تک ایک ہی رنگ میں رنگا ہوتا ہے یعنی عشق و محبت کی ابتدا۔ پھر ہجر و فراق کی مصوبتیں اور مصائب اس کے بعد آخر میں غم آگین انجام۔ آپ کے فسانوں کو پڑھنے کے بعد اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ آپ کے نزدیک خدا

ایک ظالم، بیدرد اور اندھی قوت کا نام ہے۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

”مریم سے اب ضبط نہ ہو سکا، روؤف نے اس کے دل کے نازک ترین حصے کو چھیر دیا تھا۔ وہ زار زار رونے لگی۔ روؤف سے نہ رہا گیا۔ اس نے بڑی جرأت کی اور مریم کو اپنے حلقہ آغوش میں لے کر، اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ مریم نے اپنے کورؤف کی ٹوک سے الگ نہیں کیا۔ اس کورؤف کے نرم دگداز بدن سے راحت مل رہی تھی۔ اس کے آنسو کسی طرح نہ ٹھٹھتے تھے۔ روؤف نے تسلی دینے کی لاکھ کوشش کی مگر سب بیکار“

”ادریس نے مسکرا کر کہا۔“ میں نے اس معاملہ پر کافی غور کر لیا ہے۔ سکون و اطمینان ہر شخص کے حصہ کی چیز نہیں۔ یہ اپنا اپنا کردار اور اپنا اپنا چھن ہے۔ جو انسان کی زندگی بناتا اور بگاڑتا ہے۔ چنانچہ یہ میرا ہی کردار تھا جس نے مجھے برباد کیا اور میرے ساتھ دو معصوم اور بیگناہ عورتوں کو خاک میں ملا دیا۔ خدا کی بخت میرے سامنے نہ نکالو جس چیز کو تم خدا کہتے ہو، میں اس کو ایک اندھی قوت سمجھتا ہوں۔ جو ایک نا ترا عقل بچے کی طرح حسین چیزوں کے ساتھ پہلے تو کھیلتی ہے اور پھر ان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ رہ گئی محبت، سو میرا خیال ہے کہ اس دنیائے حوادث میں اس کا وجود نہیں اس دنیا کی محبت کے متعلق اترنے پر سچ کہا ہے

واقعی کون کس کو چاہے ہے ہر کوئی واہم میں نہا ہے ہے

”عشق کی ابتداء انفرادیت سے ہوتی ہے اور شاید تمام ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد بھی یہ انفرادیت باقی رہتی ہے۔ جب تک عشق کا نشہ آپ پر چھا نہیں جاتا۔ جب تک عقل و ہوش کا غلبہ ہو۔ جب تک آپ دہرم کا پرچار کیجئے۔ تبلیغ کیجئے۔ اخلاقیات کی اشاعت کیجئے۔ فلسفہ اور تصوف کی حمایت کیجئے۔ یا اور جو کچھ چاہئے کہئے اور کیجئے۔ مگر جہاں آپ نے عشق کی دنیا میں قدم رکھا، آپ جو کچھ اب تک کہتے یا کرتے آئے ہیں۔ اس سے نخل ہونا پڑتا ہے۔ اور آپ ”برد کہ بادہ مائع بہ ازیں ہند است“ کہہ کر سب کو حرف غلط سمجھنے لگتے ہیں“

”مریم نے لاکھ چاہا کہ اپنی ناکامیوں اور تلخیوں کو قدرت کے دلفریب مناظر میں بھول جائے لیکن اس کو بہت جلد معلوم ہو گیا۔ کہ یہ مناظر اب اس کے لئے دلفریب نہیں رہے۔ اس کے دل کی آواز دراصل دھوکہ کی آواز تھی۔ جو لمحے ایک بار گزر گئے وہ پھر نہیں آتے۔ جو زندگی ایک بار بسر ہو گئی اس کا اعادہ ناممکن ہے۔ یونان کے ”روننے والے فلسفی“ کا قول ہے۔ کہ ”ایک ہیندی میں کوئی دوبار نہیں نہا سکتا۔“ جس دریا میں آپ نے ابھی غسل کیا ہے وہ دوسرے لمحے میں بالکل ایک دوسرا دریا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بات فوراً محسوس نہیں ہوتی۔ زندگی کے بہاؤ میں کبھی ایک حالت کو

اپنی جگہ قرار نہیں ہے جس چیز کو آپ ایک دفعہ کھو چکے اس کی بازیافت محال ہے جو بات ایک بار ہو چکی اس کی "بادگشت" قانون قدرت کے منافی ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ آپ "ریجن نو میدی" کی تاب نہ لاسکیں اور عمر بھر کف انوس مل کر "تجدید تمنا" کا عہد کرتے رہیں۔

ایم۔ اسلم

آپ کے فسانے عموماً طبعزاد ہوتے ہیں۔ کسی حد تک جدت بھی پائی جاتی ہے۔ فسانوں میں عموماً گھریلو اور روزمرہ زندگی کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ فسانے مختصر اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ مزاحیہ رنگ میں بھی اچھے فسانے لکھتے ہیں کردار نگاری کے بڑے شائق معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ "مرزا جی" کے کردار کو خوب خوب پیش کیا ہے۔ زبان عام فہم روزمرہ، اور سادہ ہوتی ہے۔ ترکیبیں، پنجابی، بھونڈی اور جملے اکثر بے جوڑ ہوتے ہیں۔ بعض فسانوں کا پلاٹ دلچسپ اور نتیجہ خیز ہوتا ہے اور بعض میں پلاٹ مفقود ہوتا ہے۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

"حسن :- غلطی، لیکن میری اپنی ہے، تجھے خود جانا چاہئے تھا"

بیوی :- "تو جاؤ۔ ہاتھ جوڑو۔ منت کرو۔ معافی مانگو"

حسن :- "بھائی سے معافی مانگنا، یا اُس کی منت کرنا کوئی گناہ نہیں"

بیوی :- "کون کتنا ہے کہ گناہ ہے۔ لیکن شرم اور غیرت بھی تو کسی جانور کا نام ہے"

حسن :- "شرم اور غیرت کیسی؟ بھائی کے سامنے گردن جھکانے یا فدا مٹ کا اظہار کرنے میں ہرگز عار نہیں آتی چاہیے"

"مٹی کے دے سب کو ٹھپڑوں میں مل رہے تھے۔ دوران کی دیسی دھیس لڑی۔ میں عمدتوں کی چمکتی ہوئی پوشاکیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد ننھے کی ماں جو اُسے دیکھنے کے لئے کوٹھری کی طرف گئی تو دو ایک اور بھی اس کے ساتھ ہو لیں۔

ننھا مزے سے پاؤں پھیلائے کھاٹ پر پڑا سورا تھا اور اس کی چچی اس کے ننھے ننھے پاؤں سے گال لگائے روتے روتے سو گئی تھی۔ دیے کی ہلکی ہلکی روشنی میں سونے والے کے گونے کنارے کے پیڑوں پر بھی اُسی سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی"

(مزاحیہ)

الیکشن کا وقت تو دس بجے تھا لیکن آپ بارہ بجے کے بعد کیمپ میں پہنچے۔ آپ کے جاتے ہی لوگوں نے "مرزا زندہ باد" کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ دوپٹ تو وقت پر پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ آپ پہنچے ہی تھے کہ اتنے میں خبر

آئی کہ چنودا لے اپنے کھاٹ کھٹو لے اٹھا کر میدان چھوڑ گئے ہیں۔ بس اب کیا تھا۔ سلامی کے گولے چلنے لگے۔ کیمپ میں مبارک سلامت کا غل بلند ہوا۔ مرزا صاحب نے اسی وقت واپسی کا اعلان کر دیا۔ اور کہا کہ ہمارا مقابلہ تو صرف چنو سے تھا زندہ رہے تو اگلے سال شیخ جی سے بھی پیٹ لیں گے۔“

نیا ز فتنچوری

آپ کے فسانے عموماً طبع مزاد اور بہت بلند پایہ ہوتے ہیں۔ ترجمے بھی اپنی سلاست اور روانی کے لحاظ سے اور پینل معلوم ہوتے ہیں۔ پلاٹ عموماً دلچسپ ہوتا ہے۔ کردار نگاری پر عبور حاصل ہے۔ طرز بیان بہت دلکش اور عبارت بہت بلند پایہ ہوتی ہے یعنی عربی اور فارسی کی بڑی بڑی ترکیبیں اور محاورے استعمال کرتے ہیں۔ جو موزوں تو ہوتے ہیں لیکن عام فہم نہیں ہوتے تشبیہات اور استعارات کی بہتات ہوتی ہے، لیکن یہ بھی دلکشی سے خالی نہیں۔ ایک خصوصیت آپ کے فسانوں کی یہ ہے کہ جس منظر کو جس حالت میں دیکھتے ہیں اُسے ویسا ہی بیان کرتے ہیں، اس لحاظ سے آپ کے فسانوں کے متعلق یہ خیال ہے کہ ”عریاں“ ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر فسانے ”حسن و محبت“ کے واقعات سے لبریز ہوتے ہیں۔ جن میں رنگینی اور دلکشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ بہت کم فسانوں میں اصلاحی درس اور گھریلو زندگی کے مناظر پیش کرتے ہیں فلسفہ محبت اور فلسفہ زندگی پر بھی اکثر واقعات تبصرہ کرتے ہیں۔ ہر فسانہ جدت سے ملبو ہوتا ہے اس کے علاوہ بعض فسانوں میں نفسیاتی پہلو پر بھی نظر ڈالتے ہیں لیکن ان کا اثر دیر پا نہیں ہوتا۔ مجموعی طور پر آپ کے فسانوں میں زندگی کے روشن پہلو، یعنی مسرت و عشرت کے مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

”مراندائے جس وقت راہب کی گفتگو سنی، اس کی برہمی کی کوئی انتہا نہ رہی اور اس وقت جبکہ وہ جام کو لبوں تک پہونچا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اپنی تشنہ کامی کے خیال سے دیوانی سی ہو گئی۔ اور انتہائے غیظ و غضب کی حالت میں کرسی پر بیٹھ کر راہب کو اپنے اوپر گرا لیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اسی حالت میں اُسے مضبوط پکڑ کر بلند آواز سے چیخنے لگی۔“ دوڑو۔ دوڑو۔ مجھے راہب سے بچاؤ۔“

”سوشیلا سمجھتی تھی کہ حقیقت حال نہ تارا سے کہی جاسکتی ہے اور نہ رنجور سے۔ ممکن ہے تارا یہ معلوم کرنے کے بعد کہ مجھے بھی رنجور سے اتنی ہی محبت ہے، جتنی اس کو، جانبر نہ ہو سکے، اور رنجور یہ سن کر کہ تارا اس پر فریفتہ ہے کوئی نازیبا خیال اس کی طرف سے دل میں پیدا کر لے۔ اس کے ساتھ جب وہ تارا کی حالت کو دیکھتی تھی۔ تو بیتاب ہو جاتی تھی۔ وہ اس کا ہر وقت کا سوگ۔ وہ اس کا ہر دم اندر ہی اندر سلگنا۔ وہ اس کا محبت کی آگ میں شمع کی طرح جل کر

پکھلتے رہنا، اک ایسا منظر تھا کہ سوشیلا کو اکثر اوقات اپنی محبت کی طرف سے دھوکا ہو جاتا تھا۔

”شہاب تم مسئلہ ازدواج و محبت کو دنیا کے اور مسائل میں کیوں شامل کرتے ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ حصولِ مدعا بری چیز ہے۔ لیکن خاص مسئلہ نکاح، اور نکاح بھی وہ جو نتیجہ محبت قرار دیا جائے۔ سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ ایک شخص، مدعا اس چیز کو قرار دیتا ہے۔ جو حقیقتاً مدعا نہ ہونا چاہئے۔ اگر محبت کا نتیجہ صرف نکاح ہونا چاہئے تو میں کہوں گا کہ آگ کا کام بہا لیجانا، اور پانی کا کام جلا دینا ہونا چاہئے۔ محمود، افسوس ہے کہ تم سا ادیب اور تم سا لطیف الخیال شخص، محبت کی نزاکت کو نہیں سمجھتا۔ لوگ محبت کا نام کس آسانی سے لے لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ انھیں بھی خبر نہیں کہ اس کا نصب العین کیا ہے۔ اور اس کا اقتضاء کیا۔ اگر محبت نام ہے صرف اس جذبہ شہوانی کا جو جو وہ پندرہ برس کی عمر میں شروع ہو کر تیس چالیس برس میں فنا ہو جاتا ہے۔ اگر محبت کا مفہوم تمھارے ہاں صرف وہ ہیجانِ عصبی ہے جو نتیجہ ہوتا ہے نشو و نما کی پختگی کا تو تمھیں اپنی محبت کی کامیابیاں مبارک“

”جب کبھی وہ صبح، خانہ باغ کی روشوں پر ٹپکتی ہوتی اور آفتاب طلوع ہوتا تو یہ تمیز کرنا دشوار ہو جاتا کہ آیا آفتاب اس پر طلوع ہوا ہے یا یہ آفتاب پر۔ اور سورج کی کرنیں اس کے چہرہ کو منور کر رہی ہیں یا اس کے جسم کی شعاعیں آفتاب کو۔ مشہور تھا کہ کوئی تنفس ملکہ ناہید کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اور اگر کسی نے دیکھ لیا، تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس بجلی کی پھانس اس کے دل سے بہ آسانی نکل گئی ہو اس کا رنگ جسم یہ معلوم ہوتا تھا کہ نثرن زار فردوس کی صباحت میں ہلکا سا رنگ شفق ملا کر بلوریں جلد کے نیچے دوڑا دیا گیا“

مزاحیہ فسانہ نگار

(الف)

احمد شاہ بخاری، پطرس

آپ کے فسانے عموماً اور یچٹل (طبعاً) ہوتے ہیں۔ جن میں خوش مذاقی (Light humour) بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ مزاحیہ فسانہ نگاری میں آپ ایک ممتاز طرزِ نگارش کے مالک ہیں۔ زبان نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم ہوتی ہے۔ روزمرہ میں ایسے ایسے تبسم آفریں جملے لکھ جاتے ہیں کہ بغیر ہنسے رہا نہیں جاسکتا۔ ابتذال کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ البتہ زبان کی غلطیاں کمیں کمیں موجود ہوتی ہیں۔ بعض فسانوں میں پلاٹ ہوتا ہے۔ اور بعض میں نہیں۔ مجموعی حیثیت سے پلاٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ طرزِ بیان بہت دلکش ہوتا ہے اور کردار

کو بھی خوب رنگ دیتے ہیں۔ آپ کے فسانے صرف تفریحی ہوتے ہیں۔ اور تفسن طبع کا باعث یعنی نہ تو ان میں سوشل اصلاح مد نظر ہوتی ہے۔ نہ معاشرتی نقائص پر کوئی تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں

”دوکاندار بڑھکر میرے پاس آیا۔ لیکن میری زبان کو جیسے تالا لگا ہوا تھا۔ عمر بھر کبھی کسی چیز کے نیچنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں آخر بڑی سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ ”یہ بالیسل ہے“

دوکاندار کہنے لگا۔ ”پھر“ میں نے کہا۔ ”لوگے؟“ کہنے لگا۔ ”کیا مطلب؟“ میں نے کہا۔ ”بیچتے ہیں ہم“ دوکاندار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بالیسل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا۔ پھر بالیسل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بالیسل کون سی ہے۔ آخر کار بولا ”کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟“ ایسے سوالوں کا خدا معلوم کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔ ”کیا تم یہ پوچھتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے۔ صرف کیا ہوگا؟“ کہنے لگا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی اس کا لے کرے گا کیا؟“ میں نے کہا۔ ”اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا؟“ کہنے لگا۔ ”اچھا چڑھ گیا پھر؟“ میں نے کہا۔ ”پھر کیا۔ پھر چلائے گا اور کیا۔“ دوکاندار بولا۔ ”اچھا“ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بالیسل بکنے آئی ہے“

”لالہ جی۔ لالہ جی“ جواب آیا۔ ”ہوں“ میں نے کہا۔ ”آج یہ کیا بات ہے کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے کہنے لگے۔“ تو اور کیا تین بچے ہی سورج نکل آئے؟“

خدا کی قسم تین بچے کا نام سنکر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا۔ ”کیا کہا تم نے تین بچے ہیں؟“ کہنے لگے۔ ”تین۔ تین۔ کچھ سات۔ سات۔ سات۔ سات۔ دو پر تین ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ارے کبوت! خدائی فوجدار! بدترین کمیں کے۔ میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سوتے ہی نہ دینا۔ تین بچے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے تین بچے ہم اٹھ سکا کرتے۔ تو اس وقت دادا جان کے منظور نظر نہ ہوتے۔ ابے احمق کمیں کے۔ تین بچے اٹھ کے ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ امیر زادے ہیں۔ کوئی مذاق تھوڑا ہے۔“

”لاحول ولا قوہ“ دل تو چاہتا تھا کہ تشدد اور عدم تشدد کو خیر باد کہہ دوں لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے ہمیں اپنے کام سے غرض ہے۔ لیمپ بجھایا اور پھر بڑبڑاتے ہوئے سو گئے“

شوکت تھانوی

آپ کے فسانے عموماً طبع مزاج اور ان میں مزاج پوری طرح موجود ہوتا ہے ابتداء ان ہکاری سے آپ کی

تحریریں بھی پاک ہوتی ہیں۔ پلاٹ بعض فسانوں کا بہت خوب ہوتا ہے۔ عبارت رنگین، دلکش اور تبسم آفریں ہوتی ہے، عام فہم اور روزمرہ لکھتے ہیں۔ طرز بیان عام پسند ہوتا ہے۔ روزمرہ زندگی کے واقعات میں مزاح پیدا کرتے ہیں لیکن تحریریں اثر اور اصلاح سے خالی ہوتی ہیں۔ ان سے محض وقتی تفریح ہو سکتی ہے۔ کوئی خاص سبق نہیں ملتا۔ کردار نگاری کہیں کہیں بہت بہتر ہوتی ہے۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

”لیکن انھوں نے صرف یہ جواب دیا۔“ کا جانی بھیا۔ ہم کا ناہیں مالوم۔“ یہ خالص سودیشی ریل کے، سکند کلاس کے معزز پاسنجر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجبوراً ہم پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ”اگر مسافر کا پنور کے زیادہ ہوئے تو وہاں جائے گی۔ ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں چلی جائے گی۔ اس لئے اب تک انجن نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف۔“ ہم نے گھبرا کر پوچھا۔ ”لیکن یہ فیصلہ کب ہوگا۔؟“ جواب ملا۔ ”جب گاڑی بھر جائے گی اس وقت فیصلہ ہو سکتا ہے۔“ ہم نے پھر پوچھا۔ ”لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا۔“ جواب ملا۔ ”کہ ہو جایا کرے۔ جب تک ریل نہ بھر جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے۔ کیا خالی ریل چھوڑ دی جائے؟“

”سکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی بھی آگئے تھے اور ڈرائیور بھی تھا۔ مگر ایک کونلہ کے نہ ہونے سے سب کا ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ کامل ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد للو فائر مین کونلہ کی گٹھری لئے یہ کہتا ہوا آپہونچا۔“ ”آدھی رات کو کونلہ منگانے چلے ہیں تمام دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ایک دوکان پر اتنا سا کونلہ تھا۔ وہ بھی بمشکل تمام ایک روپیہ نو آنے میں ملا ہے۔ بھاگتا ہوا آ رہا ہوں۔ راستہ میں گر بھی پڑا تھا۔ تمام گھنٹے چھل گئے۔ کونلہ وغیرہ دن سے منگا لیا کرو۔“ ڈرائیور نے جلدی سے کونلہ ڈالا۔ اور سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑی، گاڑی چلی ہی تھی کہ ایک شور مچ گیا۔ ”روکو روکو۔ گارڈ صاحب رہ گئے۔“

”بیوی۔“ اے اپنی گت تو دیکھو۔ ہائے میں لٹ گئی۔“ بڑھن۔ ”گت کیا دیکھیں؟ عاشقوں کی یہی شان ہوتی ہے۔ تم تو ماشا اللہ پڑھی لکھی ہو۔ ذرا قصہ لیلیٰ مجنوں اٹھا کر دیکھو کہ مجنوں، جس کا آج ڈنکانج رہا ہے کس شان سے رہتا تھا۔“ بیوی۔ ”ہائے میں لٹ گئی۔ ہائے میں کہیں کی نہ رہی۔“ بڑھن۔ ”اس میں لٹنے کی کون سی بات تھی ایک قمیص میں نے اپنے شوق کے لئے پھاڑ لی۔ تو یہ لٹ گئیں۔ تم کو میرا عشق ایسا ہی برا معلوم ہوتا ہے تو جانے دو۔ میں نہیں کروں گا عشق۔ لاؤ کوئی پاجامہ بکس سے نکال دو۔ مگر اب مجھے بیکاری کا طعنہ نہ دینا۔“

عظیم بیگ چنتائی

آپ ہمیشہ طبعاً د فسانے لکھتے ہیں جو زیادہ تر خود ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ طرز بیان سادہ، سلیس، عام فہم اور سید دلچسپ ہوتا ہے۔ عبارت بعض اوقات محاوروں اور استعارات سے بھی لبریز ہوتی ہے۔ مزاحیہ رنگ میں لسانی زبان خوب نکلتے ہیں۔ پلاٹ عموماً دلچسپ ہوتا ہے۔ گھریلو زندگی پر اکثر اصلاحی نظر ڈالتے ہیں۔ تحریر زیادہ مؤثر یا اس کا اثر دیر پا نہیں ہوتا۔ عموماً تقریحی باتیں ہوتی ہیں یا جن سے وقتیہ فرحت حاصل ہوتی ہے۔ کردار نگاری خاصی اچھی ہوتی ہے بعض اوقات مبالغہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور فطرت تصنع سے بدل جاتی ہے۔ سنجیدہ فسانے بھی لکھتے ہیں جن میں پلاٹ کے علاوہ طرز بیان بہت دلچسپ اور معنی خیز ہوتا ہے اور اس میں اصلاحی رنگ خاص طور پر چمکتا ہے۔ محاوروں اور زبان کے اکثر نقائص پائے جاتے ہیں۔ مختلف نمونے حسب ذیل ہیں

” ایک دھندلے کا سا عالم تھا۔ میں نے جھانک کر نیچے صحن میں دیکھا۔ تین چار پلنگ کچھے ہوئے تھے۔ اور گھر والے غافل سو رہے تھے۔ یہ کچھری میں سر رشته دار تھے جن کے مکان میں خاکسار جھانک رہا تھا۔ دبے پاؤں میں زینہ سے اتر کر نیچے پہونچا۔ اور سایہ کی طرح مکان کے دوسرے بازو کی طرف پہونچ کر میں نے اپنی ” بھوت آفرینی “ شروع کر دی نعمت خانہ کھول کر دیکھا۔ دودھ رکھا تھا وہ پی گیا۔ کیونکہ مقوی پیر ہے۔ لڈو تھے وہ کھائے۔ تین انڈے تھے وہ جیب میں رکھے۔ اس کے بعد ہر وہ چیز جو سامنے نظر آئی۔ اس کو الٹا رکھ دیا۔ ہندیاں، گھڑے، برتن، پیڑھی وغیرہ سب کو الٹا رکھ دیا پھر جان پر کھیل کر صحن کی طرف آیا۔ بڑی ہوشیاری اور خاموشی سے میں نے سب کے جوتے اکٹھے کر کے بغل میں دا بے اور پھر باورچی خانہ میں واپس آیا۔ ایک پتیلی میں پانی ڈال کر گھی اور مصالحہ تماش کر کے نمک مرچ ڈال کر جوتے پکھنے کو رکھ دئے “

ملاح نے ایک مرتبہ اور پانی میں پتو ار ڈال کر زور سے چکر کی تیزی میں اضافہ کر دیا میری یہ حالت ہو گئی کہ سر پھٹا جاتا تھا۔ اور یقین ہو گیا کہ سر چکر اگر اب موت واقع ہو رہی ہے۔ چودھری صاحب نے اب دہائی اور تہائی دینا شروع کی۔ اور میں پڑے پڑے ان کی کوشش کی داد دے رہا تھا۔ وہ چلا رہے تھے۔ ” اے نالایق شیخ

..... برحمتک کم بخت اشدہ المن الرقص ارے اخرج من الگرداب

ارے مودی ناؤ نکال “ چکر اگر وہ پھر میرے اوپر گرے۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ ساری دنیا گھوم رہی تھی۔

چودھری صاحب نے پھر دھاڑ کر کہا۔ ” ایہا شیخ ابے آلو ابن الالو و الخنزیر ردک

ارے نکال واسد قسم خدا کی ارے بھی شیخ ارے اشدہ المن الرقص ارے

مرے..... ابے روک۔ روک ارے نکال..... یا اللہ..... اے ایسا شیخ من المودی اخریج من لما گرداب..... نالائق بد معاش والدہ بھی شیخ۔ ” مگر تو بہ کیجئے۔ بھلا ان باتوں سے کہیں ناؤ رکنے والی تھی“
(سنجیدہ)

نوری اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا نازکی، کا ہاتھ بدستور اس کے ہاتھوں میں تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ کو نرمی سے دباتے ہوئے عجیب پیرایہ میں کہا۔ ”میری، جو باتیں خود سمجھ میں نہیں آتی تھیں ان کو میں دریافت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دراصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ کی طرف سے جو خیالات میرے دل میں تھے ویسے ہی میری طرف سے آپ کے دل میں بھی ہیں“ ”پھر آپ نے کیا پایا“ ”آپ کی اور اپنی حالت کو یکساں پایا۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم دونوں میں محبت کی بنیاد دراصل اسی وقت سے ہی استوار ہو گئی۔ جب ہم دونوں کو اس کا علم ہوا کہ یہ رشتہ قائم ہوگا“

فرحت المذہبک دہلوی

آپ ایک بہت کمزور مشق مزاحیہ فسانہ نگار ہیں۔ سب سے بڑی خصوصیت آپ کے فسانوں کی یہ ہے کہ وہ اصلاحی ہوتے ہیں اور اکثر ”پیروڈی“ جن سے معاشری اور سماجی نقائص کو دور کرنا مقصود ہوتا ہے۔ زبان خالص دہلوی، محاورات اور استعارات سے مزین، بلند پایہ اور معنی خیز ہوتی ہے۔ طرز بیان بہت دلکش، عام فہم اور تبسّم آفریں ہوتا ہے۔ اور بہ نسبت اور مزاح نگاروں کے آپ کی تحریریں کافی مؤثر اور ان کا اثر دیر پا ہوتا ہے۔ پلاٹ دلچسپ بناتے ہیں اور کرداروں کی خصوصیات کو پوری طرح روشن کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت میں ایک پختگی پائی جاتی ہے بعض فسانوں میں اخلاقی درس بھی موجود ہوتا ہے۔ نمونے ملاحظہ ہوں

”آر سی مصحف کے لئے ہم کو بھی اندر بلایا گیا۔ ہماری بیوی بھی گود میں لدی ہوئی آئیں ہم دونوں کے پنج میں آئے اور کلام مجید رکھا گیا۔ ادھر سے دو سالہ اوڑھا گیا۔ ہم کو حکم ہوا کہ سورہ اخلاص پڑھ کر آئے میں بیوی کا منہ دیکھو۔ ہم نے بیوی کی صورت دیکھنے کی خوشی میں الٹی سیدھی صورت اخلاص پڑھ کر آئے پر جو نظر ڈالی تو اوپر کاسانس اوپر اور نیچے کاسانس نیچے رہ گیا۔ یا اللہ یہ عورت ہے یا۔“ ”بی شادی“ والدہ صاحبہ نے ان کی تعریف ”آدمی کے نیچے“ سے کی تھی لیکن مجھے تو ان کے آدمی کا بچہ ہونے میں بھی شبہ ہے۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ڈومنی نے کہا ”میاں کہو“ بیوی میں تیرا غلام ذرا آنکھیں کھولو۔“ میں نے اس پر ”ہشت“ اس زور سے کہا کہ ڈومنی بیچاری تو گھبرا کر پرے سرک گئی۔ اور ہماری والدہ صاحبہ نے اس کی جگہ لے کر وہی فقرہ کہا۔ ایک دفعہ کہا۔ دو دفعہ کہا۔ جب تیسری دفعہ کہا تو میں نے جواب دیا۔ ”سنئے صاحب میں ایسی خوبصورت بیوی کا غلام بننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ چاہے

آپ بھلا مانیں یا بُرا مانیں۔“ میرا یہ منہ تھا کہ ساری مجلس ”دھم“ ہو کر رہ گئی۔“

”اس کے بعد تو میں نے ٹھان لی کہ کچھ بھی ہو، عشق کر کے رہوں گا۔ میں نے پھر اپنے دل سے فیصلہ کرنا چاہا۔ بہت کچھ سوچتا بچا رہا۔ یہی سمجھ میں آیا۔ میاں عاشق حسین، تمہارے نام میں بھی اللہ نے کوئی نہ کوئی ضرورت بات رکھی ہے نام تو عاشق اور ہے ہوائے کچھ بھی نہیں۔ وہی نہ، نام بڑا اور درشن تھوڑا۔ جیسا نام ویسا کام بھی کرو۔ خالی پہلی نام کے عاشق کیا۔ عشق کر کے عاشق بنو تو کوئی بات بھی ہو۔ بوڑھا پے کی ست تو آج کل کے چھو کرے بُرا بھلا کہتے ہی ہیں مگر سچ پوچھو تو انھیں تمیز بھی نہیں۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ روز بھی نہیں ہوئے کل کی بات ہے۔ ننگے پیر پھرا کرتے تھے۔ ان میں عقل و شعور کہاں سے آیا۔ لگے بڑھوں کو بے وقوف سمجھنے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ جوانی چند روزہ ہے۔ اور پھر عقل تو بڑھتا ہے پختہ ہوتی ہے“

”یہ تو ہوئی ہمارے لکچر کی تمہید۔ اما بعد۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس کمرہ کی کتنی دیواریں ہیں (آوازیں آئیں چار) بالکل ٹھیک۔ کوئی عمارت بغیر چار دیواری کے قائم نہیں رہتی۔ اس لئے عقل کی بھی چار دیواریں ہیں۔ کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ چار دیواریں کیا ہیں؟ (خاموشی) بہت تیرے کی۔ وہ مارا پا پڑا لے کو۔ جب تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ عقل کی چار دیواریں کیا ہیں تو تم سمجھے میرا لکچر۔ اب تم خود ہی تسلیم کر لو کہ تم سب دیوانے ہو۔ میں لکچر ختم کئے دیتا ہوں (حاضرین۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں) تمہاری دیوانگی کا یہ دوسرا ثبوت ہے۔ ہٹ دھرمی بے وقوفی کی خاص علامت ہے اور بے وقوفی دیوانگی کا دوسرا نام ہے۔ تو ہاں عقل کی چار دیواریں ہیں۔ مطالعہ فطرت۔ متابعت فطرت، مشاہد فطرت اور بس (آوازیں آئیں یہ تو صرف تین دیواریں ہوئیں) تین دیواریں۔ اچھا تین ہی سہی۔ چوتھی دیوار ہم خود ہیں۔ یعنی نمونہ فطرت۔ کہو اب تو چار دیواریں ہو گئیں یا نہیں“

طنز یہ فسانہ نگار

(س)

رشید احمد صدیقی علیگ

آپ اپنے رنگ کے واحد فسانہ نگار ہیں۔ یا نیاز صاحب فنیچوری کی زبان میں۔ ”رشید صاحب کا طنز بانی رنگ حقیقتاً ایک بلند پایہ تنقید ہے؛ ایک پاکیزہ ”انحلال جذبات“ ہے اور حقیقی معنی میں اس ”ادب لطیف“ کا نمونہ ہے۔ جس کو اصول تربیت کے لحاظ سے ”کنڈرگارٹن“ طریق انشاء بھی کہہ سکتے ہیں۔“ آپ کے فسانوں کی

سب سے بڑی خصوصیت ”طنز نگاری“ ہے جس کا نتیجہ سماجی اصلاح ہوتا ہے۔ آپ سوسائٹی کے نقائص اور غیوب پر اس قدر معنی خیز انداز سے تنقید کرتے ہیں کہ مزاح کا مزاج ہوتا ہے اور اصلاح کی اصلاح طرز بیان بہت بلند پایہ، معنی خیز، اور دلکش ہوتا ہے۔ پلاٹ آپ کے یہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کردار نگاری قابل ذکر ہوتی ہے۔ آپ کی تحریروں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کا اثر دیر پا ہوتا ہے اور ان کو پڑھنے کے بعد ایک شخص میں یہ احساس خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ وہ ان کو پڑھ کر اصل واقعات سے ان کا مقابلہ کر کے کوئی نتیجہ نکالے۔ نمونے ملاحظہ ہوں

”دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک زمیندار اور پٹواری موجود ہیں اس کی ساری ملکیت منقولہ ہے۔ الا عورت شہری اس کا قائل ہے جب تک یورپ اور دولت حتی قائم ہے۔ اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے۔ الا عورت۔ دیہاتی عورت کو مایہ عزت سمجھتا ہے اور شہری آلہ تفریح۔ دیہاتی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کا مکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے، بولتا ہے، آرام کرتا ہے۔ پناہ لیتا ہے اور کشاکش حیات سے عمدہ برآ ہونے کے لئے تازہ دم ہو کر نکلتا ہے۔ تعلیم یافتہ کے نزدیک عورت ایک عضویاتی ضرورت ہے یا ایک وسیلہ تفنن، جس کے لئے اس نے چوپائی اور اپالو تعمیر کیا ہے دیہاتی پناہ اور آرام چاہتا ہے۔ شہری صرف غم غلط کرنا چاہتا ہے۔ دیہاتی کے ہاں محنت، دیانت اور عورت ہے۔ شہری بھی عورت کا طالب ہوتا ہے لیکن غیرت و دیانت سے نہیں۔ بلکہ مکر و دولت سے۔ آج چوپائی اور اپالو دریا برد ہو جائیں۔ تو وہ جلد سے جلد کوئی اور اپالو تعمیر کر لے گا۔ کسان کے بھونپڑے پر یہ آفت آئے تو یہاں سطح آب پر آ پالو اور چوپائی کی خس و خاشاک یا گندگی نہیں آ سکتی۔ بلکہ موجوں کے ساتھ ایک خیف سی ہلکی رنگین تحریر۔ چوپائی اور اپالو کی تعمیر دولت اور شین سے ہوتی ہے۔ یہ ایک لحظہ، تعمیر ہوتے ہیں اور اپنے تعمیر کرنے والوں کی دولت اور حُسن کی مانند ایک لحظہ میں فنا ہو جاتے ہیں۔ جھونپڑا نسلوں کی تعمیر ہے، نسلوں کے فنا ہونے کے بعد بھی قائم رہتا ہے“

”اتفاق وقت کلکٹر صاحب اور ڈپٹی صاحب ساتھ ساتھ کہیں مورے پر تھے۔ بالو گنیش مل، پُرانے زمانے کے ایک مختار وکیل، ایڈوکیٹ، بیرسٹر سب ہی کچھ تھے بوڑھے، قانون کے علاقہ سب کچھ پڑھے ہوئے، قدرے شاعر، نہایت طرار، حاضر باش، حکام رس، حاضر جواب، کسی مقدمہ کی پیروی میں کیمپ کے ساتھ ساتھ تھے۔ اور خانساں وغیرہ کے ساتھ بیٹھتے تھے کے دو چار کش پی رہے تھے۔ قضا را رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک طرف بیت الخلا تھا۔ لوٹائے ہوئے بدحواسی کے ساتھ داخل ہوئے۔ وہاں جو دیکھتے ہیں تو ڈپٹی فتح علی خاں صاحب موجود ہیں ع

تو کوئی ہمہ تخت سہراب بود

لوٹا فوراً زمین پر رکھ دیا۔ جھک کر سلام کیا۔ اور پھر لوٹا وہیں چھوڑ کر فرار ہوئے تو کہا جاتا ہے۔ کہ جب تک ڈپٹی فتح علی صاحب اسی ضلع میں رہے۔ بالو گنیش لال کو کسی نے عدالت کے احاطہ میں نہیں دیکھا“

” فی الحال مجھے یہ بتائے کہ اچھے سے اچھے کھانے سے علاج کرنا کس اصول پر مبنی ہے۔ اور پھر یہ اصول صحیح بھی ہو تو آپ بتائیے کہ ہندوستان ایسے مفلس ملک میں آپ کا یہ علاج کس طور پر کامیاب ہو سکتا ہے۔ فرمایا۔ ہندوستان کے لوگ ڈاکٹر ورنات کے علاج المامون بالیموں کے متحمل ہو سکتے ہیں تو پھر علاج بالغذا کے کیوں نہ متحمل ہوں گے؟ میں نے کہا۔ مرشد خوب یاد دلایا۔ اور یہ تو بتائے یہ علاج بالغذا آپ کے نزدیک کیسا ہے۔ فرمایا علاج ہیمونی ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں ہے۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ علاج بالاعضاء کرائیں گے اور آج سے کم و بیش سو سال کے اندر آپ دیکھیں گے کہ طبیوں کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں“

”جمو رابی“

رسالہ جن کے گزشتہ پرچے

بہ حساب ایک آنہ (۱۰) فی پرچہ ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائے۔ رسالہ جن اپنے موضوع کے لحاظ سے ہندوستان میں پہلا پرچہ تھا جو ادیٹر نگار کی ادارت میں دو سال تک نکلتا رہا ان پرچوں میں جس قسم کے مضامین نکل چکے ہیں۔ وہ اب کبھی میسر نہیں آسکتے۔

غیر نگار لکھنو

بازی گر

آلفو - مصری بازی گر کا نام ہر شخص کی زبان پر تھا۔ تمام شہر میں اس کے کمالات کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ضعیف الاعتقاد لوگ تو اس کے بعض کرتبوں کو معجزات سے تعبیر کرنے لگے تھے۔ عقل میں نہ آنے والی باتیں ہمیشہ تحریفز ثابت ہوتی ہیں۔ اور یقیناً کمال اسی چیز کا نام ہے۔ کہ ایک مرتبہ اصحاب عقل و دانش بھی اپنے دل سے یہ سوال کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ بعض نقاد کی رائے تھی کہ وہ علم تنویم کا ماہر ہے۔ اور محض اپنی قوت مقناطیسی سے کام لے کر ناظرین کے احساسات عارضی طور پر مسحور کر دیتا ہے۔ اس طرح کہ ہر شخص کو وہی چیز نظر آتی ہے۔ اور وہی آواز سنائی دیتی ہے۔ جس کا تصور وہ خود اپنے ذہن میں کرے۔ بہر حال حقیقت جو کچھ بھی ہو۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ گزشتہ ہفتہ کی رات میں اور کرشن بھی دم بخود رہ گئے

ہم دونوں دوست جب تماشہ گاہ میں داخل ہوئے تو اسٹیج کے سامنے رنگین پردہ آویزاں تھا۔ کیونکہ وقت معینہ میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ تمام نشستیں بھر چکی تھیں۔ اور کہیں تل رکھنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ پھر بھی شائقین کا سلسلہ کسی طرح ختم نہ ہوا تھا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے موسیقی کی ایک دلنواز دے کے ساتھ پردہ اٹھا۔ بوڑھا آلفو اپنے اصلی لباس میں تقری اور طلائی تینے آویزاں کئے ہماری نظر کے سامنے تھا۔ مختصر الفاظ میں اس نے تمام ناظرین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور اس رات کا لاکھ ارباکر پس پردہ چلا گیا

دوسرا پردہ اٹھا اور اس کے کمالات کی نمائش شروع ہو گئی۔ تمام کام وہ خود کرتا تھا۔ صرف دو خواتین معمولی معاونین کی حیثیت سے شریک عمل تھیں۔ ہر کھیل کے بعد ایک منٹ کے لئے پردہ گرتا اور پھر اٹھ جاتا۔ پہلا شعبہ ختم ہونے کے بعد ہم نے رائے قائم کی کہ شاید یہ اس بادی گر کا شاہکار ہے۔ مگر ہمیشہ دوسرے شعبے نے ہماری توقع کو پامال کر دیا۔ تمام فضا خاموش تھی اور ہر شخص پر ایک سکوت طاری تھا

تفصیل اگرچہ خالی از دلچسپی نہیں مگر دقت طلب ضرور ہے۔ تاہم آخر شعبہ کو جو بلاشبہ شاہکار کا درجہ رکھتا ہے نظر انداز کر دینا ناممکن ہے اس شعبہ کو "نقاب پوش نشانہ باز" کے نام سے موسوم کیا جائے تو بہتر ہے۔ اس قسم

دنیاۓ اسلام کا عظیم انقلاب

تاریخ کا منارہ - تمدن کا ستون - قوموں کی زندگی کا اہم اصول اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف مذہبی اصول ہیں مذہبی اصول ہمیشہ قوموں کی زندگی کا نہایت اہم عنصر اور تاریخ کا نہایت نمایاں جزو رہے ہیں۔ چنانچہ تاریخ کے عظیم الشان واقعات نے جو عظیم الشان نتائج پیدا کئے ہیں ان میں مذاہب کے بننے اور بگڑنے کا نتیجہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ گزشتہ اور موجودہ زمانہ میں جو اساسی مسائل قرار دیے گئے ہیں ان میں پہلا اساسی مسئلہ ہی مذہب تھا

ہمیں یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ تاریخ کے ابتدائی زمانہ سے آج تک ہر نظام حکومت اور ہر نظام تمدن کا سنگ بنیاد مذہبی عقائد کی سطح پر رکھا گیا ہے۔ یہی معبود ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کا سب سے بڑا دور تشکیل کیا ہے۔ مذہب اس برق رفتاری سے اخلاق پر اثر ڈالتا ہے کہ اس معاملہ میں عشق کے سوا کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مگر عشق بھی تو ایک مذہب ہی ہے یہ دوسری بات ہے کہ وہ شخصی مذہب ہے اس لئے ہمیشہ قائم نہیں رہتا اگر تم اس قوم کی حالت کا اندازہ کرنا چاہتے ہو جو صرف مذہب سے متاثر ہو کر پھر گئی تو تم عروج اسلام کی تاریخ کو دیکھو

عروج اسلام تاریخ انسانی کا عجیب انگیز واقعہ ہے۔ اس کی ابتدا ایسی سر زمین اور قوم سے ہوئی جو اولاً کسی شمار میں نہ تھی۔ اسلام نے ایک ہی صدی میں نصف کرہ زمین کو لڑا ایمان سے منور کر دیا۔ اس نے بڑی بڑی سلطنتوں اور مملکتوں کے مستقل مذہبوں کو تہ و بالا کر کے نفوس اقوام کو نئی ترکیب دی اور ایک مکمل نئی دنیا یعنی دنیاۓ اسلام کی تعمیر کی

اعتقادات کے اندر ایک ایسا موثر جادو پنہاں ہے جو مزاج عقلی کو بالکل بدل دیتا ہے جو مذہب فحش سے نہیں بلکہ اُمید سے پیدا ہوتا ہے اس کا اثر دائمی ہوتا ہے۔ اسلام نے انسان کی عقل کے سامنے سعادت کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اور اس دنیا پر تمام موثرات سے ممتاز ہو گیا ہے۔ اور فلسفہ اس منزل سے کوسوں دور ہے

اگر ہم سیاسی حیثیت سے بھی نگاہ ڈالیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ مذہبی عقائد کا اثر کس قدر شدید ہے ؟۔ مذہب کی عظیم الشان قوت کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ ایک زمانہ میں قوم کے فوائد قوم کے احساسات اور قوم کے خیالات کو متحد کر دیتا ہے۔ اس لئے وہ ان تمام عناصر کا جن سے قومی روح پیدا ہوتی ہے۔ دفعۃً قائم مقام ہو جاتا ہے۔۔۔ مذہبی قوت کے استیلا سے تمام قوتوں کا رخ صرف ایک مقصد کی طرف ہو جاتا ہے۔ مذہب کی عظیم الشان طاقت کا ادا اسی اصول کے اندر مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی جن قوموں نے کارہائے نمایاں کئے ہیں اسی قسم کے مذہبی انقلاب کے زمانہ میں کئے ہیں اور دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کی تاسیس اسی دور انقلاب میں ہوئی ہے۔ اسلام نے قبائل عرب کو متحد کر دیا اور اسلام کی قوت سے اقوام عالم کو زیر و زبر کر کے انھوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی

نفس اعتقاد کوئی چیز نہیں ہے۔ اصلی چیز وہ قوت ہے جو عقائد کو دل میں مرکز کر رہتی ہے۔ یہ قوت معبود حقیقی کا عطیہ ہے جو خدا اپنے مذہب کے قیام کے لئے عطا فرماتا ہے۔ خدا خود کہتا ہے *لَوْ اَنفَقْتُ مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا* الفت بین قلوبہم اگر تم زمین کی تمام دولت صرف کر ڈالتے تب بھی ان کے دلوں کو متحد نہیں کر سکتے چنانچہ *اَمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَمَلْتُ عَلَیْکُمْ نَعْمَتِی* کی قوت نے دو ہی نسلوں میں چمکتے ہوئے ہلال۔ سیر پیر سے لے کر کوہ ہمالیہ تک اور صحرائے ایشیا کے متوسط سے لے کر صحرائے افریقہ متوسط تک نصب کر دیا

جن مذاہب کے معبود خود ساختہ ہوتے ہیں ان کے پرستاروں کے عزم و ارادہ میں شدت و صلابت نہیں ہوتی اس لئے ان کو کامیابی آہستہ آہستہ اور بہت کشمکش کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اور آخر کار کسی زبردست بادشاہ کی امداد سے جو خود اس مذہب کا مقلد ہو جاتا ہے اُن کو عروج حاصل ہوتا ہے۔ سچی مذہب کے لئے قسطنطین بودھ کے لئے اشوک اور زرتشتیوں کے لئے کینخسرو ایسے سلاطین نے جنھوں نے اپنے اختیار کردہ مذاہب کو اپنی عظیم مادی و دینی قوت سے عروج کی سناں پر پہنچایا

ہر قوم کی سیاسی۔ اخلاقی اور صنعتی تاریخ اگرچہ اس کے مذہب سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح مذہب نظام اخلاق بر اثر ڈالتا ہے اسی طرح خود نظام اخلاق سے متاثر ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہر قوم کی زندگی کے رکن عظم صرف دو ہیں۔ مذہب اور اخلاق۔ لیکن ہر قوم کا نظام اخلاق اپنے اصلی اوصاف کے لحاظ سے ہمیشہ قائم رہتا ہے اور اسی خصوصیت نے ہر قوم کی تاریخ کو متحد اور جامع و مانع بنا دیا ہے مگر مذہب اپنے اندر تغیر پذیری کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی تغیر کی بنا پر قوموں کی تاریخ میں بہت سے انقلابات کی سرگزشت نظر آتی ہے

معمولی مذہبی تغیر بھی مستقل و متواتر انقلابات کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ پہلی تین صدیوں سنہ ۶۰۰ء سے سنہ ۱۰۰۰ء تک بلاد اسلامی دنیا کے سب سے زیادہ مذہب اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصے تھے۔ نصرانی مغرب سے جو آدینہ مظلمہ ۱۰۰۰ء انخطاط سلطنت روم سے ۱۴۵۳ء تک فتح قسطنطنیہ تک کی تاریخی چھپائے ہوا تھا۔ اسلامی مشرق کا

کھلا ہوا مقابل بنا۔ دسویں صدی عیسوی سے انحطاط کے آثار نظر آنے لگے۔ اسلامی جمہوریت اور مذہبی شیفتگی کی جگہ خود مختاری اور دنیوی جاہ طلبی لینے لگی۔ عربی تمدن پر غلبی اثرات رفتہ رفتہ غالب آنے لگے۔ دنیا اسلام کا وجود مسلمانوں کی قوت ایمان پر ہے کیونکہ قوت ایمان ہی اس عظیم الشان سلطنت کا سنگ بنیاد ہے اس لئے جب قوت ایمان میں ضعف آنے لگا تو دنیا اسلام کا انحطاطی دور شروع ہو گیا

۱۶۸۳ء میں جب ترکوں کی وائنا میں شکست ہوئی تو مسیحی یورپ کو یقین ہو گیا کہ دنیا اسلام کی قوت ترین قوت دینی انتہائی کمزوری کو پہنچ گئی ہے اس وقت سے لے کر ترکی سلطنت پر بے رحمانہ مسیحی حملے متواتر ہو رہے ہیں۔ مگر اسلامی دنیا نے بہ ہدایت نجومی مسیحی حملوں کی ضرب کا احساس انیسویں صدی کے قبل تک نہیں کیا۔ اٹھارہویں صدی کے دوران میں مغرب نے اسلامی صغوں کے پہلوؤں میں پھر مشرقی یورپ اور انڈیز میں حملہ کیا لیکن دنیا اسلام کا ایک بڑا حصہ مراکش سے لے کر ایشیا و متوسط تک محفوظ رہا۔ اس وقفہ سے اسلامی دنیا نے کوئی نفع نہیں اٹھایا۔ اس وقت بھی اگر قوت ایمان کے کھوئے ہوئے سرمایہ کو جمع کر لیا جاتا تو آج صورت حال دگرگوں ہوتی اس وقت دنیا اسلام کا مقابلہ ایسے یورپ سے تھا جس کی سرگرمیاں صنعتی انقلاب سے بڑھ گئی تھیں۔ اور جدید علوم سے مسلح تھا۔ جدید اختراعات نے قدرت کے اسرار کو منکشف کر کے اس کے حملہ آور ہاتھ میں ایسے ہتھیار دیدیئے تھے جو دہم و گمان میں بھی نہ تھے نتیجہ ناگزیر تھا۔ قوت ایمان سے محروم اسلامی سلطنتیں مغربی حملوں کے سامنے یکے بعد دیگرے زیر ہو گئیں۔ اور کل اسلامی دنیا بہت جلد مسیحی قوتوں میں تقسیم ہو گئی۔ انگلستان نے ہندوستان و مصر تا کاروس نے کوہ قاف کے پار جا کر ایشیا کے متوسط پر قبضہ کیا۔ فرانس نے شمالی افریقہ کو فتح کیا اور دیگر مسیحی اقوام نے اسلامی وراثت کے چھوٹے چھوٹے حصے پائے۔ ان فتوحات کا آخری درجہ جنگ عظیم میں ظاہر ہوا۔ اس جنگ کے اختتام پر جو صلح نامہ کے شرائط لکھے گئے ان سے دنیا اسلام کی مغلوبیت کا غد پر مکمل ہو گئی

کاغذ پر اس لئے کہ عین ظاہری کامیابی کے وقت مسیحی قوتوں کو ایسا چیلنج دیا گیا کہ جس کی مثال پہلے نہیں ملتی۔ اس مغربی فتوحات کے صد سالہ زمانہ میں دنیا اسلام میں اہم اندرونی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ مغربی تودی کے روز افزوں سیلاب نے آخر کار خواہ بیدہ مشرق کو بیدار کر دیا۔ اور دنیا اسلام پر آخر کار یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ ”جب قوموں کے مبعود پردہ خفا میں چھپ جاتے ہیں تو وہ بہت دنوں تک زندہ نہیں رہتیں“ اس حقیقت کے احساس نے پچیس کروڑ مسلمانوں میں مراکش سے لے کر چین تک اور ترکستان سے لے کر کانگو تک ایک ایسا ہیجان پیدا کر دیا ہے کہ جس نے اگرچہ خاص شکل ابھی تک اختیار نہیں کی ہے تاہم اس کی شدت اور قوت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ پہلی جنگ عظیم صحرائے عرب یعنی عہد اسلام میں روشن ہوئی انیسویں صدی کے آغاز میں ایمان کے سرمایہ کے جمع کرنے کے لئے وہابی تحریک شروع ہوئی۔ جس نے فوراً حیات اسلامی کی دہلی ہوئی آگ کو بھڑکا دیا۔ اور

اسی سے اپنے موقع پر اتحاد بین الاسلامی شروع ہوا

محمد بن عبدالوہاب تقریباً سترہویں صدی میں صحرائے عرب کے وسطی علاقہ یعنی نواح نجد میں پیدا ہوئے۔ جب خلافت کی شکل خداداد جمہوریت سے مشرقی مطلق العنانی میں تبدیل کی گئی تو آزادی پسند عرب متنفر ہو کر اپنے صحراؤں کو واپس چلے آئے۔ اور یہاں انھوں نے اپنی بدوی آزادی کو قائم رکھا۔ بے شک ترکوں نے ساحل بحر قزحہ اور بلاد مقدسہ پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ لیکن نجد یعنی اندرونی وسیع حصہ آزاد تھا۔ مذہب اور سیاسیات میں نجدی عرب اپنے اجداد کے عقائد کے مقلد تھے۔ اسلام کی سادگی اور جمہوریت پر وہ فدا تھے۔ عبدالوہاب کے علم و تقدس کی شہرت بہت جلد ہو گئی۔ سالہا سال تک وہ اطراف عرب میں گھومتے رہے اور بالآخر انھوں نے قبیلہ سعود سے شیخ محمد کو جو نجد میں سب سے بڑے سردار تھے۔ اپنا ہم خیال بنالیا۔ اس سے عبدالوہاب کو اخلاقی طاقت اور مادی قوت حاصل ہو گئی رفتہ رفتہ صحرائی عربوں میں آغاز اسلام کا سیاسی اتحاد قائم ہو گیا۔ سترہویں صدی میں عبدالوہاب نے اس دائرہ فانی سے کوچ کیا سعود ان کے قابل جانشین ہوئے نجد کو مستحکم کر کے سعود نے دنیا دار اسلام کو فتح کرنے کی تیاری کی اول منزل بلاد مقدسہ کے اوائل میں بلاد مقدسہ کو فتح کر لیا۔ سترہویں صدی کے وسط میں سعود شام پر فوج کشی کر رہے تھے فوت ہو گئے کچھ عرصہ کے لئے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہابی کل مشرق کو خس و خاشاک سے صاف کر کے ایک ہی دور میں اسلام کو خرابیوں سے پاک کر دیں گے لیکن تقدیر الہی یوں نہ تھی۔ سلطان ترکی نے اپنے مشہور و معروف طاقتور نائب محمد علی کو جو اس وقت حکومت مصر پر قابض تھے وہابیوں کے مقابلہ کے لئے تعینات کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مقامات مقدسہ واپس لے لئے گئے اور وہابی افواج ریگستان میں پسپا کر دی گئیں۔ بڑھنے والی وہابی سلطنت سراب کی طرح غائب ہو گئی اور وہابیت کا سیاسی دور ختم ہو گیا

لیکن وہابیت کے روحانی دور کا اب آغاز ہوا۔ نجد اصلاحی جوش کا مرکز رہا اور یہاں سے نئی روح کی تنویر اطراف عالم میں پھیلی گئی۔ فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے تمام دنیا کے اسلام سے جو حجاج آئے وہ پر جوش مصلح بن کر واپس گئے۔ اس نئے مذہبی جوش نے دور دراز مقامات میں ہلچل ڈال دی۔ مثلاً شمالی ہند میں ایک وہابی جانیباز سید احمد نے ایک مذہبی سلطنت قائم کر لی مگر ان کی ناگہانی موت سے شمالی ہند میں وہابی فتوحات کا امکان جاتا رہا اس سلطنت کو سکھوں نے ۱۸۴۳ء میں برباد کر دیا۔ اگرچہ سلطنت مٹ گئی لیکن اس کے اثرات قائم رہے۔ انیسویں صدی میں مشہور سید محمد بن سنوسی اپنے وطن الجزائر سے مکہ آئے۔ اور اس نئے مذہبی جوش سے متاثر ہو کر اس عظیم بین الاسلامی اخوت کی بنیاد ڈالی جو ان کے نام سے موسوم ہے۔ فارس میں بابی تحریک اگرچہ اصولاً وہابیت سے بالکل بیگانہ تھی لیکن بلاشبہ یہ بھی وہابی اقتصاد کا دوسرا پہلو تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ہی قرن میں خالص وہابی تحریک بڑھ کر ایک عام تحریک یعنی دنیا دار اسلام کے دور جدید میں تبدیل ہو گئی۔ اس میں بھی بجا

خود مختلف صورتیں پیدا ہو رہی تھیں اور ان میں سے خاص تحریک وہ ہے جو اتحاد بین الاسلامی کہلاتی ہے اس تحریک کا جو سیاسی پہلو ہے اس کا ذکر انشا اللہ تعالیٰ کسی دوسری صحبت میں ہوگا اس مضمون میں اسلامی بیداری کے دیگر پہلوؤں پر خصوصاً جنکا مذہب اور تمدن سے تعلق ہے غور کرنا ہے

وہابی تحریک صحیح معنوں میں خالص اصلاح تھی اس کا مقصد خرابیوں کی اصلاح ضعیف الاعتقادی کی رسوائی کا انسداد اور ابتدائے اسلام کا احیاء تھا۔ ہر مذہبی اصلاح کی اول منزل یہ ہے کہ وہ اپنے ابتدائی عقائد کی طرف عود کرے۔ مذہبی مصلح کے لئے بدعات مابعد سے بلا لحاظ ان کے اوصاف کے انکار کرنا ہی اصلاح کا واحد ذریعہ ہے

موجودہ زمانہ کی اصلاحی حریت کی ابتدا اگرچہ وہابی تحریک سے ہوئی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کسی زمانہ میں بھی احرار سے خالی نہیں رہا۔ دنیا سے اسلام کے انحطاطی اور زوالی دور میں بھی ظلمت و گمراہی و باطل کے خلاف اعلا کلمۃ الحق کے لئے بلند ہوتی رہیں۔ مثلاً سولہویں صدی میں علامہ الغزالی نے لکھا تھا کہ یہ ذرا بھی ناممکن نہیں ہے کہ وہ ادراک جو خدائے تعالیٰ نے ازمنہ ماضیہ کے لوگوں کو عطا نہ فرمائے ہوں آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ رکھے ہوں۔ مبداء فیاض ہر قرن کے عقلاء کے قلوب پر اپنے انعام اور تجلیات کی کسی تراوش کو کبھی بیکار نہیں کرتا۔ اسلام کے عہد زوال کی ان حق پرست صداؤں نے زمانہ حال کے مصلحین کی ہمت بڑھائی اور انیسویں صدی کے وسط تک ہر اسلامی ارض میں احرار کی جماعتیں پیدا ہو گئیں بلاشبہ ان کی تعداد ابتدا میں ناقابل التفات تھی۔ مولویوں نے ان کی تکفیر کی اور عام جہال جو مولویوں کے زیر اثر تھے ان سے نفرت کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کا خلوص۔ نیک نیتی۔ فداکاری اور قومی و دینی خدمات نے مولویوں کے مکرو فریب کے جال کو توڑ دیا

جنگ کریمیا کے بعد سے عبدالحمید کی خود مختاری کے زمانہ تک احرار ترک حکومت کی روح رواں تھے رشید پاشا اور مدحت پاشا جیسے احرار ترکی وزراء نے سلطنت عثمانیہ کی تجدید و آزادی کی حقیقی لگن کا میاب کوشش کی۔ سلطان عبدالحمید کے مظالم بھی ترکی حریت کو فنا نہ کر سکے یہاں تک کہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب نے احرار ترکوں کو بہ سراقہ قرار کر دیا۔ مصر میں حریت کی بنیاد مستحکم ہو گئی اور اس کے نمایندے شیخ محمد عبده رکن جامعہ ازہر ایسے آزاد خیال میدان عمل میں نظر آنے لگے

یہ احرار مصلحین بلاشبہ اسلامی تدریجی ترقی کے جزو ہیں یہ قدامت پسند بہترین معنی میں ہیں اور صحت بخش تبدیلی کے قبول کرنے والے ہیں تاہم وہ اپنے موروثی توازن کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ سچے مذہبی لوگ ہیں۔ اور ان کا ایمان ہے کہ اسلام زندہ اخلاقی قوت ہے اور قوت ایمان ہی نے انھیں میدان عمل

عزیز احمد زبیری

(نگار) گفتگو اس امر میں نہیں کہ مذہب نے دنیا میں حکومتیں قائم نہیں کیں، یا اپنے متبعین میں مرکزیت دیک جتنی پیدا نہیں کی بلکہ سوال یہ ہے کہ اس نے قیام امن و سکون میں کتنا حصہ لیا اور بنی نوع انسان کو کس حد تک ایک خیر ازہ سے وابستہ کیا اگر آج تمام مسلمان ہم خیال ہو کر متفقہ قوت سے دوسری قوموں پر غرور کر کے ان کو تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو کیا یہ کامیابی اس امر کی دلیل ہو سکتی ہے کہ مذہب اسلام سچا مذہب ہے، یا ایک مذہب کا انتہائی نقطہ نظر صرف دنیاوی حکومت کا قیام ہو کرتا ہے۔ اگر یہ نظریہ صحیح مان لیا جائے تو اس وقت عیسوی مذہب سے زیادہ سچا کوئی دوسرا مذہب نہیں ہو سکتا کما جاتا ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا سبب صرف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مذہب کو چھوڑ دیا۔ مدعا یہ کہ اس سے قبل کسی وقت جب وہ پابند مذہب تھے تو صاحب اقبال و عروج تھے، پھر آپ اس اقبال و عروج کا کوئی زمانہ متعین کیجئے یعنی دور عباسیہ لیجئے یا دور بنی امیہ، عمید خلفاء لیجئے یا کوئی اور زمانہ اس کا نمایاں ترین پہلو ملک گیری و دوست حکومت کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا، جس کا نام آپ نے عروج و ترقی رکھا ہے، اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس سلسلہ میں کافی خونریزی سے کام لیا گیا

اس لئے جس حد تک محض نظریہ مذہب کا تعلق ہے۔ آپ پاکیزہ سے پاکیزہ جذبات انسانیت و اخوت لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں، لیکن دنیا کے عمل میں مذہب نے ہوائے خونریزی اور خون آشامی کے تاریخ کے صفحات پر کوئی اور نقوش نہیں چھوڑے

ایک مذہب کا انتہائی نقطہ نظر اخلاقی حیثیت سے صرف یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سرمایہ داری کو دنیا سے محو کر دے، لیکن آپ کسی مذہب کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے، آپ کو معلوم ہوگا کہ وہی سب سے بڑا ذریعہ قیام سرمایہ داری کا بنا اور اسی لئے اس نے انسانی خون بہانے میں کبھی کوئی تامل نہیں کیا۔ اگر کما جائے کہ یہ جو کچھ ہوا وہ سب تعلیمات مذہب کے منافی تھا، تو پھر مذہب کا خیال ہی اک لغو و بیکار خیال ہے کیونکہ دنیا کے عمل میں وہ اس لحاظ سے کبھی کامیاب نہیں ہوا اور کوئی ایک تجربہ بھی اس کی موافقت میں پیش نہیں کیا جاسکتا

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس وقت جبکہ مذہبی روح لوگوں میں بہت ضعیف ہو گئی ہے، کیوں وہ مدعا حاصل نہیں ہوتا، لیکن معترض نے اس پر غور نہیں کیا، حالت موجودہ قومیت و وطنیت کا جو جذبہ کام کر رہا ہے اور جس نے ایک گود دوسرے کا دشمن بنا رکھا ہے، وہ بھی مذہب ہی کے اثرات باقیہ میں سے ہے۔ یعنی اگر مذہب پہلے خدا کا نام لے کر خونریزیوں کو روا رکھتا تھا تو اب خدمت ملک و قوم کے بہانہ سے جائز قرار دیتا ہے۔ اور اخوت عامہ کو عملاً رواج دینے سے

جو بے اعتنائی مذہب نے کسی وقت اختیار کی تھی وہ اب بھی اسی طرح پائی جاتی ہے اور ہمیشہ پائی جائے گی جب تک قوم عالم اپنی تہذیب و معاشرت کا اخذ اصلی مذہب کو قرار دیتی رہیں گی۔ کیا عیسوی تہذیب، اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب کی تفریق سے آپ مذہب کے خیال کو کسی وقت علیحدہ کر سکتے ہیں اور کیا کوئی قوم ایسی پائی جاتی ہے جس نے اپنی تہذیب مذہب سے بالکل علیحدہ ہو کر قائم کی ہو اس لئے موجودہ عہد ترقی میں جبکہ مشرق و مغرب کا انسان ایک ہی نظام اقتصاد و تمدن سے وابستہ نظر آتا ہے، مذہب و قومیت سے گزر کر ایک اور بلند سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کا امن و سکون کیونکر قائم رہے، تمام بنی نوع انسان ایک رشتہ سے کس طرح وابستہ کئے جائیں۔ اور اس کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ دنیا سے استعمار و سرمایہ داری کو معدوم کر دیا جائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مذہبیت یا قومیت پر نوع انسانی کی تفریق یا اس کا افتخار قائم ہے۔

پھر اگر واقعی بغیر کسی مذہب کے انسان ترقی نہیں کر سکتا اور دنیا امن و سکون سے آشنا نہیں ہو سکتی، تو اس مذہب کا نام صرف "لا مذہبیت" ہونا چاہئے "لا قومیت" ہونا چاہئے اور وطنیت سے مراد صرف یہ ہونا چاہئے کہ ہم سب ایک ہی کرہ کے رہنے والے ہیں، ایک ہی ستارہ میں پیدا ہوئے ہیں اور مادر گیتی کے فرزند ہونے کے لحاظ سے ہم سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

غالب کی شوخیاں اور شوخ نگاریاں

دنیا میں مشہور ہے۔ لیکن اگر کوئی آپ سے کہے کہ اس کے حالات زندگی، اس کے کلام نظم و نثر، اس کی تصانیف اردو و فارسی سے یکجا کر کے سب کی سب کتابی صورت میں پیش کیجئے تو آپ کے لئے اس کا صرف ایک جواب ہو گا اور وہ یہ کہ

رسالہ نگار بابت ماہ جنوری ۱۹۳۷ء

اٹھا کر دیکھئے جس کے ۱۶۰ صفحات اسی موضوع کے لئے وقف ہیں۔ اور پورا استقصار کر کے ان کو یکجا کر دیا گیا ہے پھر اگر یہ رسالہ آپ کے پاس نہیں ہے یا گم ہو گیا ہے، یا آپ کے کسی اور دوست کو ضرورت ہے یا اس کے بعد سے آپ نگار کے خریدار ہوئے ہیں۔ تو ۱۲ روپے کے ٹکٹ بھج کر طلب کر لیجئے۔ صرف چند کاپیاں رہ گئی ہیں۔ غالب کی عالم شباب کی سہ رنگی تصویر بھی اس میں شامل ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

نوشتہ میاں،

حیران ہوں کہ تمہیں شادی کی مبارکباد دوں بھی تو وہ الفاظ کہاں سے لاؤں، جو تم سننا چاہتے ہو، کیونکہ اس حادثہ کی خبر اس قدر اچانک، اتنی غیر متوقع طور پر معلوم ہوئی کہ اگر تم مجھ سے ملاست کا تقاضہ کرتے تو اس کے لئے بھی کوئی مناسب لفظ مجھے نہ ملتا

جس وقت سوچتا ہوں کہ تمہارا نازک دل شادی کے رد عمل کو کیونکر برداشت کر سکے گا تمہاری ”میرزا منشی“ ناز برداریوں کی تاب کیونکر لاسکے گی اور تمہاری آدادہ روی کب تک ان سنہری بیڑیوں سے لطف اندوز ہوتی رہے گی، تو دل کانپ اٹھتا ہے، تمہارے انجام کے خیال سے نہیں، بلکہ اس غریب کے انجام سے جو اپنے ہزاروں ارمان تمہاری آغوش میں سوچنے آئی ہے،

بہر حال اگر اس نو عمری میں تم نے یہ ذمہ داری اپنے سر لی ہے تو اسے نباہنے کی کوشش کرو اور تم کہ اس وقت تک تم نے اتنی عمر دوسروں ہی سے ایثار چاہا ہے، اب خود بھی ایثار کرنا سیکھو۔ جوانی میں بوڑھا ہو جانا اتنا مشکل نہیں جتنا بڑھاپے میں جوان بننا۔ پہلے آسان کام اختیار کرو تا کہ بعد کو مشکل کام بھی آسان ہو جائے۔ جواب کی ضرورت نہیں میں خود آؤں گا اور بغیر تمہارے کے معلوم کر لوں گا کہ تم نے کس حد تک میرے کہنے پر عمل کیا

نیاز

محترم،

دیوان کی رسید تو میں پہلے ہی روانہ کر چکا ہوں۔ پھر یہ تقاضہ کیا؟ مدعا غالباً یہ ہو گا کہ میں نے اپنی رائے کیوں پیش نہیں کی۔ اول تو میں کیا اور میری رائے کیا، دوسرے یہ کہ سورج کو سورج کیا کہوں۔ میں کیا دنیا معترف ہے آپ کا کمال خود یہ خراج اس سے وصول کر لیتا ہے

زبان آپ کی حسانہ زاد، ذہانت آپ کی کنیز، پاکیزگی خیال آپ کی ماں جانی،

رہ گیا عشق سواس کے لئے آپ کی ہرزہ کار جوانی کافی ضمانت ہے — شاعری آپ نہ کریں گے تو کیا میں
کروں گا جس کو گناہ کرنے کا سلیقہ عطا ہی نہیں کیا گیا — اگر کبھی یہ نعمت میسر آگئی تو زیادہ دل کھول کر داد دوں گا،
فی الحال تو اسی نار سالی کو قبول فرمائے

نیاز

سنئے صاحب — یہ جھگڑایوں طے نہ ہوگا، آپ اپنی خو چھوڑنے سے رہے اور میں اپنی وضع چھوڑنے
سے رہا، یعنی اگر آپ کو یہ صند ہے کہ غلط کو ہمیشہ صحیح کے جائیں گے تو میں کیوں آپ کی رعایت سے صحیح کو غلط کہوں
میں پھر کہتا ہوں اور علی رؤس الاشتماد کہتا ہوں، بہ بانگ دہل کہتا ہوں کہ محن صاحب نے کبھی بھولے
سے بھی آپ کا نام نہیں لیا اور آپ کے مخبر صادق کا یہ اصرار ہے کہ نہیں یہ سارے کانٹے انھیں کے بوئے ہوئے ہیں
بہر حال اب اس باب میں مزید مراسلت بیکار ہے، میں آئندہ جمعہ کو محن صاحب اور "اُن" کو ساتھ لے کر وہیں آ رہا
ہوں، آپ اپنے "روح القدس" کو حاضر رکھئے گا تاکہ بالمشافہ گفتگو ہو کر معاملہ صاف ہو جائے
آپ کے تگدر سے یوں تو میرا کوئی نقصان ہے نہ محن صاحب کا لیکن خواہ مخواہ اچھے بھلے تعلقات کو محض وہم
و گمان پر خراب کر لینا آپ کے لئے ضرور بُرا ہے، کیونکہ آج کو اس نے محن صاحب کی طرف سے بظن کر دیا ہے،
کل کسی اور دوست سے آپ کو بیگانہ کر دے گا۔ پھر مانا کہ آپ اپنے وقت کے "یوسف" سہی، لیکن "یوسف بے
کارواں" ہو کر جینا بھی کوئی جینا ہے

نیاز

مولانا و مرشدنا،

کرمت نامہ کا شکریہ۔ یوں تو آپ کی محبت کا ہمیشہ سے میرے دل پر نہایت گہرا نقش قائم ہے، لیکن اب
آپ کی بزرگانہ نصیحت نے کچھ اور اضافہ اس میں فرما دیا
آپ کا مشورہ بالکل درست ہے کہ یا تو میں محراب و منبر ہی کا بندہ بن رہا ہوں یا صاف صاف کہوں کہ مجھے
ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ذوق انسانی محدود نہیں ہے۔ ایک مجذوب ہے جو بالکل
خنگا پھرنا پسند کرتا ہے، دوسرا بالک ہے جو ہر وقت عباد و قبا میں مغموم رہتا ہے، لیکن ممبر ایک اور شخص ہے جو
مشراب عشق کا اعلان اس طرح کرتا ہے

عریاں تنی خوش است زین دگر است دامن چاک چاک گریبان دیدہ را

یہ تو خیر صرف شاعرانہ جواب ہوا اور ممکن ہے جناب کو پسند نہ آئے، اس لئے ساتھ ہی ساتھ مجھے ”مقصود“ کی زبان میں بھی صاف صاف کہہ دینا چاہئے کہ واقعی میں محراب و منبر کا پرستار نہیں اور اس کا اعلان ایک بار نہیں ہزار بار کر چکا ہوں، لیکن اگر لوگوں کو اب بھی میرے مسلمان رہنے کا یقین ہے تو

نہے نصیب دل کفر آشنائے نیاز

قبلہ عالم، آپ لاکھ سمجھائے، یہ بات کبھی میری سمجھ میں نہ آئے گی کہ خدا صرف مسلمانوں کا ہے اور سوائے ان کے وہ سب کو جہنم میں پھینک دے گا۔ ظہور اسلام سے لے کر اس وقت تک زیادہ سے زیادہ دو چار ارب مسلمان پیدا ہوئے ہوں گے، اور ان کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ اور مذاہب کے لوگ، پھر کیا کوئی ذی عقل اسے باور کر سکتا ہے کہ خدا ایک کو تو جنت دے اور ہزار کو دوزخ میں جلائے۔ اُن کو اتنے جہنمی پیدا کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی، اور اتنی مخلوق کو جن میں خدا جانے کتنی حسین عورتیں ہوں گی۔ آگ میں ڈال کر تر پانے سے خدا کی کون سی مسرت وابستہ ہے

آپ کے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے کہ اُس کی مرضی، اور میرے پاس بھی اس کے خلاف ایک ہی احتجاج ہے کہ

یارب ز سیل حادثہ طوفان سیدہ باد

بتخانہ کہ خالقش نام کردہ اند

نیاز

کرمی،

بر سیل شکایت نہیں بلکہ بہ طریق حکایت کہتا ہوں کہ ایک زمانہ وہ تھا جب میرے ایک ایک عریضہ کا جواب دینے کی کوشش آپ سو سو طرح کرتے تھے، یا ایک یہ زمانہ ہے کہ

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں

واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

سوچتا ہوں کہ اس انقلاب کا سبب کیا ہو سکتا ہے تو حیران رہ جاتا ہوں کیونکہ اس سے قبل بھی یہاں

یہی چشم خوفشاں تھی، یہی دل یہی جگر تھا

آپ سے پوچھتے در معلوم ہوتا ہے کہ کہیں ”موسیٰ و طور“ کا قصہ لے کر نہ بیٹھ جائیں اور پھر اُلٹا مجھی کو اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑے۔ بہر حال اگر اس باب میں قابل الزام مجھی کو ٹھیرایا جائے تو بھی مجھے ”روئے محمود خاک پائے ایلا“ والے خدا سے بہت کچھ امیدیں وابستہ ہو سکتی ہیں، لیکن قمر تو یہی ہے کہ آپ اس کا بھی اعلان نہیں کرتے۔

کاشش آپ بیمار ہوتے کہ میں خود آپ کی طرف سے "عذرِ سکوت" ڈھونڈھ لیتا، عدیم الفرصت ہونے کے اس "رسمی بہانہ" سے اپنے آپ کو دھوکا دے دیا کرتا، یہ نہ تھا تو کسی جگہ بتلائے عشق ہو جاتے کہ "خرابیِ دماغ" کا یقین کر کے صبر کر لیتا، لیکن جب یہ کچھ نہیں تو پھر سوائے اپنی "شومی قسمت" کے اور کیا کر سکتا ہوں۔

بادریجے کہ آپ کی محبت و دوستی کا خیال میرے لئے اس قدر باعثِ فخر و مسرت نہیں، جتنا آپ کی بے رخی کا خیال سوائے روح ہے، اس لئے اگر کسی کو تکلیف میں مبتلا رکھنا آپ کے مذہب میں ثواب نہیں و خدا کے لئے اس عذاب سے مجھے نجات دلائے اور زیادہ نہیں صرف اتنا ہی لکھ دیجئے کہ میرا کوئی خط آپ کو نہیں ملا۔ مجھے یقین نہ آئے بد آئے، لیکن اوروں سے تو کہہ سکوں گا، اُن کی نگاہ میں تو میں ذلیل نہ ہوں گا۔

نیاز

قبلہ روحانیاں

آپ مجھ سے عمر میں چھوٹے، تجربہ میں کم، صحت و توانائی میں ضعیف، لیکن پھر بھی آپ کو "قبلہ روحانیاں" لکھتا ہوں، آپ کا علم و فضل دیکھ کر، آپ کی فراست و دانائی کا خیال کر کے اور سب سے زیادہ اس کشش سے مجبور ہو کر جو قدرت نے آپ کی صورت، آپ کے اخلاق اور آپ کی آواز میں ودیعت کر دی ہے۔ لیکن کیا دنیا کا یہ حیرتناک واقعہ نہیں کہ باوجود اس شدید ارادتمندی کے محرومِ کرم اور بالائینہم نیاز و فتادگی نا آشنائے التفات ہوں۔

خضر نے سکندر کے ساتھ کیا کیا، اس کا صحیح حال کسے معلوم، لیکن آپ کی بے اعتنائیاں تو میرے باب میں ایسی؟ روشن حقیقت ہے کہ "کرد بیانِ ملا، اعلیٰ" بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے، پھر میں آپ سے نہ دولت و نیا چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنی تہید ستی کا عذر پیش کرنا پڑے، نہ سعادتِ اخروی کا طلبگار ہوں کہ آپ میری نااہلی سے مجبور ہو کر انکار کر دیں، بلکہ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ کے لئے سفر کرنا متعذر ہے تو تجھی کو اجازت دیں کہ چند دن آستانہ گرامی پر حاضر ہو کر لطفِ جبین سالی حاصل کر لوں۔ آپ کی بہارِ آفرینیاں تو خیر ہمیشہ ایسی ہی رہیں گی، لیکن مجھے تو اپنی جنوں سامانیوں پر زیادہ اعتماد نہیں۔

التفاتِ جوشِ وحشتِ پھر کہاں

ہو سکے جب تک بیاباں دیکھ لیں

کل سعید احمد صاحب نے آپ کا ذکر کر کے اس آگ کو اور بھڑکا دیا، ورنہ میں تو گھٹ گھٹ کر مر جائے

فیصلہ کر ہی چکا تھا

مہجور - نیاز

ادھر آؤ، لیلوں بلائیں تمھاری

خدا کی قسم کیا کام کیا ہے۔ رستم و اسفندیار کی روحیں کانپ اٹھی ہوں گی، سکندر و نبوتین کی قبروں پر لرزہ طاری ہو گیا ہوگا۔ آج کل کے سینڈلو اور گانا کا کیا ذکر ہے وہ لوگ بزدل ہیں جو اپنے سے قوی کو ٹوکتے ہیں، نامرد ہیں جو زبردست دشمن کے ساتھ معرکہ آرا ہوتے ہیں، بہادری نام ہے صرف کمزور کو ستانے کا، ضعیف کو پامال کر دینے کا، پھر ظاہر ہے کہ بیوی سے زیادہ مکر و ہستی تمھیں اپنی شجاعت دکھانے کے لئے کہاں مل سکتی تھی،

ایں کار از تو آید و مرداں چنین کنند

مجھے تو اپنی صورت اب تم دکھانا نہیں، کیونکہ مجھے تم سے نفرت نہیں بلکہ عداوت پیدا ہو گئی ہے اور میں نے عہد کر لیا ہے کہ جس طرح ممکن ہو گا تم سے اس غریب آزاری کا انتقام لئے بغیر نہیں رہوں گا۔ تبت ید البی لب

نیاز

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

۳۲	۸ دسمبر ۳۱ء	۴ مارچ ۳۲ء	۴ جنوری ۳۲ء	۴ ستمبر ۳۱ء
۱۲	۴ جنوری ۳۲ء	۸ مئی ۳۱ء	۴ اپریل ۳۲ء	۴ اکتوبر ۳۱ء
۴	۸ فروری ۳۲ء	۴ اگست ۳۱ء	۴ مئی ۳۲ء	۴ مئی ۳۱ء
۴	۴ مارچ ۳۲ء	۴ ستمبر ۳۱ء	۴ جون ۳۲ء	۴ جنوری ۳۱ء
۸	۴ اپریل ۳۲ء	۴ اکتوبر ۳۱ء		۴ فروری ۳۲ء
۴	۴ مئی ۳۲ء	۴ نومبر ۳۱ء	۴ نومبر ۳۲ء	۴ مارچ ۳۱ء
۴	۴ جون ۳۲ء	۴ دسمبر ۳۱ء	۴ دسمبر ۳۲ء	۴ اپریل ۳۱ء
۴	۴ جولائی ۳۲ء	۴ جولائی ۳۱ء	۴ مارچ ۳۲ء	۴ مئی ۳۱ء
۴	۴ اگست ۳۲ء	۴ اگست ۳۱ء	۴ اپریل ۳۲ء	۴ جون ۳۱ء
۴	۴ ستمبر ۳۲ء	۴ ستمبر ۳۱ء	۴ مئی ۳۲ء	۴ جولائی ۳۱ء
۴	۴ اکتوبر ۳۲ء	۴ اکتوبر ۳۱ء	۴ جون ۳۲ء	۴ اگست ۳۱ء
۴	۴ دسمبر ۳۲ء	۴ نومبر ۳۱ء	۴ دسمبر ۳۲ء	۴ ستمبر ۳۱ء

باب الاستفسار

ابر و برق

(جناب سید فضل حسین صاحب - بلاری)

براہ کرم مختصراً ابر و برق کی حقیقت سے آگاہ فرمائے، لیکن ایسے الفاظ میں جس کو عوام بھی سمجھ سکیں

(نگار) ابر نام ہے اُس بخار یا دھوئیں کے ذل کا جو فضا میں تیرتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور جو پانی کے قطرات لئے ہوئے اکثر منجمد حالت میں پایا جاتا ہے

جب ہوا کا درجہ حرارت اتنا گر جاتا ہے کہ اس میں جذب کی صلاحیت باقی نہیں رہتی (خواہ یہ ہوا کے زیادہ لطیف ہو جانے سے ہو یا کسی سردی کے ساتھ مل جانے سے) تو بخار کا ایک حصہ اپنی گیسوی حالت چھوڑ کر نہایت چھوٹے چھوٹے قطرات آب میں تبدیل ہو جاتا ہے، (داکٹر اسٹیکن) کا خیال ہے کہ بخار میں اس نوع کا تکاثف ہمیشہ خاک کے ذرات کے چاروں طرف ہوا کرتا ہے، یعنی بادل کا ہر قطرہ آب ذرہ خاک کے ارد گرد تکاثف بخار کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے بادلوں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بخار ہی بخار ہے درست نہیں، بلکہ وہ مجموعہ ہے پانی کے نہایت چھوٹے چھوٹے قطروں کا۔ رہا یہ سوال کہ یہ قطرات آب کیوں دفعۃً زمین پر آکر نہیں گر جاتے اس کے متعلق پروفیسر اسٹوکس کا بیان یہ ہے کہ ذرات ہوا کے تصادم کی وجہ سے قطرات آب کی رفتار بہت سست یا بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ اور ہرشل کا کہنا یہ ہے کہ ہوا کی موجیں جو نیچے سے اوپر جاتی ہیں ان کی رفتار، قطرات آب کی رفتار سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور اسی لئے وہ زمین پر گرنے نہیں پاتے۔ البتہ جب ہوا کی موجوں کی رفتار کم ہو جاتی ہو (اور یہ اکثر ہوتا ہے) تو قطرات آب زمین پر گر جاتے ہیں۔

آپ کا استفسار چونکہ مینہ یا باراں کے متعلق نہیں ہے اس لئے اس کی مزید تفصیل چھوڑ کر صرف اتر کے متعلق عرض کرتا ہوں

بادل اور گھردونوں ایک ہی قسم کی چیزیں ہیں۔ اور ان میں صرف یہ فرق ہے کہ گھردون پر چھاتا ہے اور بادل فضا میں۔ یہ زیادہ تر زمین سے ایک میل کے فاصلہ کے اندر پائے جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی ۶ میل کی بلندی پر پہنچ جاتے ہیں

بادل کی عموماً تین تہیں ہوتی ہیں۔ سب سے نیچی ۲ ہزار سے ۶ ہزار فٹ تک کی بلندی پر پائی جاتی ہے، دوسری ۱۲ ہزار سے ۱۵ ہزار فٹ تک اور تیسری ۲۰ ہزار سے ۲۴ ہزار فٹ تک بادل اکثر و بیشتر سطح زمین کے متوازی چلتے ہیں اور شاذ و نادر کبھی عمودی شکل اختیار کرتے ہیں

ماہرین فن نے بادلوں کی کئی قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک قسم تو ان ہلکے اور بہت بلند بادلوں کی ہے جو اکثر غروب آفتاب کے بعد اور طلوع سے قبل آسمان میں نظر آتے ہیں، ان کی شکل بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے گھوڑے یا بلی کی دم جن میں سفید خطوط پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی ان میں حلقے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی یہ بالکل ایسے نظر آتے ہیں جیسے کسی دریا کے ساحل پر ریگ کی موجیں۔ ان میں برف کے نہایت چھوٹے چھوٹے بلورات پائے جاتے ہیں اور ہالہ وغیرہ پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں

دوسری قسم ان گہرے بادلوں کی ہے جو سیاہ یا سرمئی روئی کے گالوں کی طرح نمودار ہو کر مخروطی شکل میں پہاڑوں کا منظر پیش کرتے ہیں۔ یہ چار ہزار سے ۶ ہزار فٹ کی بلندی تک پائے جاتے ہیں۔ یہ اکثر طلوع آفتاب کے بعد منظر روئی کے گالوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ وسیع ہو کر سہ پہر تک تمام فضا میں چھا جاتے ہیں، ایسے بادل شام کے وقت زیادہ برستے ہیں

تیسری قسم کے بادل وہ ہیں جو لانی لانی چادروں کی شکل میں پھیلے رہتے ہیں ان کی دبازت مختلف ہوتی ہے اور ۴۰۰۰ فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہوتے۔ خزان اور گرما میں اکثر نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ پھیل کر سمندر کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ چوتھی قسم ان چھوٹے چھوٹے سفید ٹکڑوں کی ہے جنہیں ہوا اڑائے لئے پھرتی ہے۔ بادلوں کی ساخت اور ان کی بلندی منحصر ہے بخار کی مقدار پر، موجات ہوا کی بلندی پر، موسم پر، درجہ حرارت پر اور سمندر کی حالت پر۔

بلند سے بلند بادل قسم اول کا ہے جو ۴۳۸۰۰ فٹ تک اونچا ہو جاتا ہے۔ بادلوں کے حلقے زیادہ تر خط استوا اور خط سرطان و جدی پر پائے جاتے ہیں۔ بادلوں میں مثبت و منفی برقی ردو ہمیشہ پائی جاتی ہے

بجلی اس برقی ردو کا نام ہے جو بادلوں کے درمیان یا بادل اور زمین کے مابین پیدا ہوتی ہے۔ کروک اور بجلی کا

محل زیادہ تر قسم دوم کے سیاہ بادل ہوا کرتے ہیں۔ بجلی کی تین صورتیں ہیں۔ ایک تو وہ پیکانی بجلی ہے جو پتلی شاخ کی طرح بادلوں کے درمیان یا زمین و ابر کے درمیان تلملاتی ہوئی نظر آتی ہے، اور اس سے مسند دھوٹی چھوٹی شاخیں پھوٹی معلوم ہوتی ہیں، یہ میلوں کے فاصلہ پر واقع ہونے والے بادلوں میں پیدا ہوتی ہے یہاں تک کہ دس دس میل کی دوری پر اس کا پیدا ہونا ثابت ہوا ہے۔ کرطک کا سبب یہ ہے کہ بجلی کی رد ہوا کے اندر غیر معمولی گرمی پیدا کر دیتی ہے اور جب وہ ادھر سے گزرتی ہے تو اس میں سے تڑاقتے کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ آواز بقا بلکہ بجلی اور روشنی کے سُرست رفتار ہے اس لئے مختلف مقامات کی بجلی سے جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں وہ یکے بعد دیگرے کانوں تک پہنچتی ہیں اور بادلوں سے جو آواز بازگشت پیدا ہوتی ہے۔ وہ دیر تک گونج قائم رکھتی ہے۔

بجلی کا فاصلہ کرطک سے پوری طرح معلوم ہو سکتا ہے۔ اگر بجلی چمکنے کے ۵ سکند گزرنے کے بعد گرج سنا دی تو سمجھنا چاہئے کہ بجلی ایک میل کے فاصلہ پر پیدا ہوئی، اگر ۱۰ سکند گزر جائیں تو دو میل، یہاں تک کہ بعض دفعہ ۵۰ سکند کے بعد آواز آتی ہے اور اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بجلی دس میل کے فاصلہ پر پیدا ہوئی تھی دوسری قسم بجلی کی وہ ہے جو گرمیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ صرف چمک سی ہوتی ہے جو بادل پر چھانی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اس کا رنگ سُرخ مائل ہوتا ہے اور اس کی قوت پیکانی بجلی سے کم ہوتی ہے۔ تیسری قسم بجلی کی وہ ہے جو گولی کی طرح کام کرتی ہے۔ اس کا قطر چند انچ سے ایک گز تک ہوتا ہے، یہ دیواروں کو شق کر دیتی ہے، زمین میں سوراخ کرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

بجلی سے جو موت و قوع میں آتی ہے اس کا سبب دماغ اور اعصاب کا تاثر ہے، کبھی کبھی یہ بالوں کو جھلٹاتی ہے، ہڈی توڑ ڈالتی ہے، جسم میں خراش پیدا کر دیتی ہے، کان کے سوراخ کے اندر سنگین کی طرح تیر جاتی ہے، کپڑے جلا دیتی ہے، زخم ڈال دیتی ہے اور فالج وغیرہ کے امراض میں مبتلا کر دیتی ہے۔

بعض مرتبہ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ وہ بعض نفوٹش کپڑے یا جلد پر چھوڑ جاتی ہے۔ ایک بار سلسلہ ۴ میں بجلی ایک مکان پر گر گئی، اس وقت گھر کی مالکہ کُرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بعد کو دیکھا گیا کہ اس کے کپڑے پر تمام وہ نفوٹش موجود تھی جو کُرسی کی پشت میں پائے جاتے تھے۔ اسی طرح سلسلہ ۴ میں ایک کسان کی لڑکی درخت کے نیچے گائے چرا رہی تھی کہ بجلی گر گئی۔ گائے تو مر گئی اور وہ بچ گئی لیکن اس کے سینہ پر گائے کی تصویر موجود تھی اس تیسری قسم کی بجلی کی نوعیت ہنوز پوری طرح دریافت نہیں ہوئی اور نہ یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ نفوٹش پیدا ہونے کے کیا اسباب ہوتے ہیں

خطابہ

(جناب سید مجتبیٰ حسن صاحب - علی پور)

کیا آپ مطلع فرما سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں فرقہ خطابیہ کونسا ہوا ہے ،
کیا اس کا تعلق جناب عمر خلیفہ ثانی سے ہے

(نگار) یہ ایک طبقہ ہے غالی شیعوں کا جو ابو الخطاب محمد بن ابی زینب الاسدی سے منسوب ہے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا نے پہلے امام جعفر صادق میں حلول کیا تھا اور پھر ابو الخطاب میں۔ ابو الخطاب نے کوفہ میں اپنے چند متبعین پیدا کر کے عیسیٰ بن موسیٰ پر (جو ۱۲۰ھ تک وہاں کا گورنر رہا تھا) حملہ کیا۔ لیکن یہ گرفتار ہو گیا اور قتل کر دیا گیا اس کے بعد اس جماعت کے بعض لوگوں نے یہ مشہور کیا کہ نہ ابو الخطاب قتل ہوا ہے اور نہ اس کے ساتھی مارے گئے ہیں ، بظاہر ایسا دکھایا گیا در انحالیکہ وہ زندہ ہیں۔ ۱۳۰ھ میں اس جماعت کی تعداد نواح کوفہ و یمن میں ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ ابو الخطاب کے بعد انھوں نے محمد بن اسماعیل بن جعفر الصادق کو اپنا امام بنایا اور اسی لیے ان کو اسماعیلیہ جماعت میں بھی شامل کیا جاتا ہے

ان کا عقیدہ تھا رسول اللہ نے اپنے بعد حضرت علی کو منصب رسالت منتقل کیا تھا۔ اور امام جعفر صادق نے اپنے بعد ابو الخطاب کو یہ لوگ جنگ کے باب میں سخت بیرحم تھے اور دشمنوں کے بچوں اور عورتوں سب کو ذبح کر ڈالتے تھے۔ تنازع کا عقیدہ بھی ان میں پایا جاتا تھا

دوا دینی شاہکار

شوہنہار۔ فلسفہ شوہنہار پر ایک بے مثل تبصرہ غیر (علامہ محمول)
مثنوی زہر عشق۔ مجلد مع رنگین تصاویر و تین مقدمات قیمت غیر

مینجر نگار لکھنؤ